تحریک تجدد اور متجددین



ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

دار الفکر الاسلامی، لاہور

نام کتاب: تحریک تجدد اور متجددین

مصنف: ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

تہذیب وٹائیٹل: ابوالحسن علوی

ناشر: دار الفکر الاسلامی

صفحات: 145

قیمت: 150 روپے

طبع اول: جنوری، 2017ء

ای میل: mzubair@ciitlahore.edu.pk
hmzubair2000@hotmail.com

ملنے کا پتہ:

☆ عبد المتین مجاہد: 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 0300-4199099

☆ مجلس تحقیق اسلامی، 99-J، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 042-35839404

☆ قرآن اکیڈمی، یسین آباد، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ 021-36337361

مصنف کی دیگر کتب:

☆ صالح اور مصلح

☆ اسلام اور مستشرقین

☆ مولانا وحید الدین خان: افکار و نظریات

☆ فکر غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

☆ عصر حاضر میں تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذ شریعت کا منہج

☆ چہرے کا پردہ: واجب، مستحب یا بدعت؟

جملہ کتب کے پی ڈی ایف ورژن کا ڈاؤن لوڈ لنک:

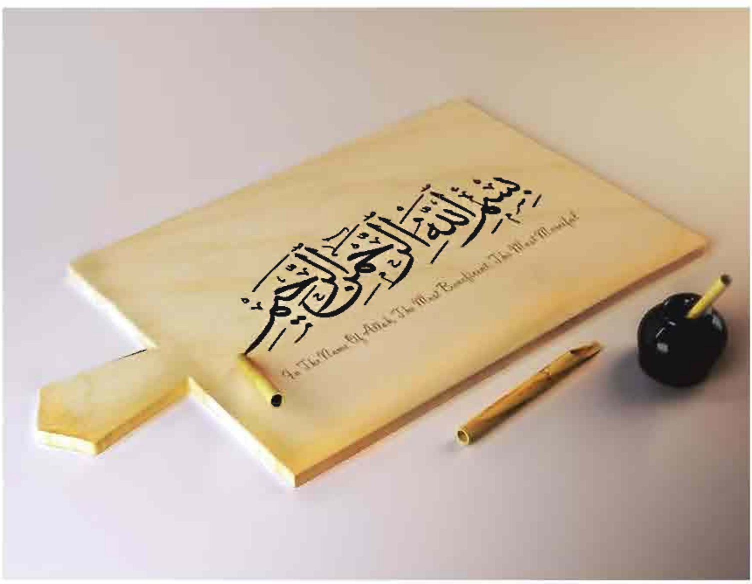
http://kitabosunnat.com/musannifeen/muhammad-zubair-temi.html

تحریک تجدد اور متجددین

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر
اسسٹنٹ پروفیسر، کامسائٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور
ریسرچ فیلو، مجلس تحقیق اسلامی، ماڈل ٹاؤن، لاہور
ریسرچ فیلو، شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی، لاہور

مکتبہ رحمۃ للعالمین

لاہور


بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
In The Name Of Allah, The Most Beneficent, The Most Merciful

﴿ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ [الأحقاف: 4]

"[اپنے موقف کی دلیل کے طور پر] میرے پاس قرآن مجید سے پہلے کی نازل شدہ کتاب یا نبیوں کی بچی کھچی علمی روایت ہی لے آؤ، اگر تم سچے ہو۔"

انتساب

شیخ الکل فی الکل مولانا نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام

فہرست مضامین

مقدمہ

موضوع کا تعارف

"تجدد" عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ 'ج۔ د۔ د، ہے۔ اس مادے (root word) سے عربی زبان میں دو اہم الفاظ استعمال ہوتے ہیں؛ ایک "تجدد" اور دوسرا "تجدید"۔ "تجدد" باب تفعّل سے مصدر ہے اور اس مصدر سے اسم الفاعل "متجدد" بنتا ہے جبکہ "تجدید" باب تفعیل سے مصدر ہے اور اس کا اسم الفاعل "مجدِد" استعمال ہوتا ہے۔ معاصر مذہبی اردو لٹریچر میں "تجدد" ایک منفی جبکہ "تجدید" ایک مثبت اصطلاح کے طور پر معروف ہے۔

باب تفعیل سے "تجدید" کا لفظ متعدی معنی میں مستعمل ہے اور "جدد الشيء" کا معنی ہو گا کسی شے کو نیا کرنا۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس لفظ میں "تاء" طلب کے معنی میں ہے، یعنی کسی چیز کو نیا کرنے کی خواہش رکھنا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تجدید اس وقت ہوتی ہے جبکہ کسی شے کے آثار مٹ جائیں۔ (مجموع الفتاوی: ۸/۱۸) یعنی جب اسلام غریب اور اجنبی ہو جائے تو پھر اس کی تجدید ہوتی ہے۔

مجدد، دین اسلام کی اصل تعلیمات پر پڑ جانے والے پردوں اور حجابات کو اٹھاتا ہے اور دین کا حقیقی تصور واضح کرتا ہے۔ پس تجدید سے مراد کسی شے کی اصلاح، اس میں اضافہ یا تبدیلی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد پہلے سے موجود ایک شے پر پڑے ہوئے حجابات کو رفع کرنا ہے۔ علامہ یوسف قرضاوی رحمہ اللہ کے بقول تجدید سے مراد کسی شے کو اس کی اصل حالت پر لوٹانا ہے مثلاً اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں دین اسلام اپنی حقیقی صورت میں موجود تھا، اس کے بعد رفتہ رفتہ لوگوں کے عقائد میں بگاڑ آنا شروع ہو گیا اور بدعتی فرقوں مثلاً خوارج، معتزلہ، جہمیہ، اہل تشیع اور کلامی گروہوں نے بہت سے باطل نظریات اور تصورات کو دین اسلام کے نام پر پیش کرنا شروع کر دیا۔ ائمہ اہل سنت نے ان باطل افکار و نظریات کی شد و مد سے تردید کی اور دین کے اس حقیقی اور صحیح تصور کو واضح کیا جس پر ان گمراہ فرقوں کی کج بحثیوں کے نتیجے میں

حجابات پڑ گئے تھے۔ اسی فعل کا نام تجدید ہے اور اس کے فاعل کو ''مجدِد'' کہتے ہیں۔ ''تجدیدِ عہد'' کی اصطلاح عربی زبان میں معروف ہے اور اس سے مراد کوئی نیا عہد باندھنا نہیں ہے بلکہ پہلے سے موجود عہد کو پختہ اور نیا کرنا ہے۔ پس اسلام کی تجدید سے مراد کوئی نیا اسلام پیش کرنا نہیں ہے بلکہ پہلے سے موجود اسلام پر گمراہ اور بدعتی فرقوں کی طرف سے ڈالے گئے حجابات کو رفع کرتے ہوئے اسلام کو از سرِ نو نیا کرنا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِاءَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا)) [سنن أبو داود، کتاب الملاحم، باب ما یذکر فی قرن المائۃ]

''بے شک اللہ تعالیٰ ہر صدی کے آخر میں اس اُمت کے لیے ایک ایسے شخص کو بھیجتے ہیں جو اُمت کے لیے اس کے دین کی تجدید کرتا ہے۔''

اس کے برعکس باب تفعّل سے ''تجدد'' کا لفظ لازمی معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ''تجدد الشيء'' کا معنی ہو گا: کسی شے کا نیا ہو جانا۔ عربی زبان میں ''تجدد الضرع'' کا معنی ہے: جانور کے دودھ کا چلے جانا۔ جب جانور کا پچھلا دودھ چلا جائے گا تو اب نیا دودھ آئے گا اور اسی کو ''تجدد الضرع'' کہا گیا ہے۔ پس تجدد کا معنی ہے پہلے سے موجود کسی شے کا غائب ہو جانا اور اس کی جگہ نئی چیز کا آ جانا۔ پہلے والا دودھ دوہنے کے بعد جانور کے تھنوں میں جو نیا دودھ آئے گا، وہ نیا تو ہے لیکن پہلے والا نہیں ہے۔ اسلام کے تجدد سے مراد یہ ہو گی کہ پہلے سے موجود اسلام غائب ہو جائے اور اس کی جگہ نیا اسلام آ جائے۔ اس کو اردو میں تشکیل جدید اور انگریزی میں ''Reconstruction'' بھی کہتے ہیں۔ یعنی اسلام کی عمارت گر گئی ہے اور اسے از سرِ نو تعمیر کرنا چاہیے۔ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ ڈاکٹر اقبال رحمہ اللہ کے ''تشکیل جدید'' کے تصور کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال مرحوم نے خطبات کا نام Re-construction رکھا، مجھے اس پر بھی اعتراض تھا، تعمیر نو یا تشکیل نو کا کیا مطلب؟ کیا عمارت منہدم ہو گئی؟ تشکیل نو کا مطلب دین کی از سر نو تعمیر کے سوا کیا ہے؟ یعنی اسلام کی اصل شکل مسخ ہو گئی، اب اسے از سر نو تعمیر کیا جائے۔ یہ دعویٰ پوری اسلامی تاریخ کو

مسترد کرنے کے سوا کیا ہے؟"(سہ ماہی اجتہاد، جون ۲۰۰۷ء، ص ۵۴)

مختصر یہ کہ تجدید ایک مثبت لفظ ہے اور دین میں مطلوب ہے جبکہ تجدد ایک منفی اصطلاح ہے اور دین میں ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔

تالیف کا پس منظر اور مقصد

راقم کی قرآن اکیڈمی، لاہور کے ریسرچ سینٹر سے 2004ء سے 2012ء کے دوران وابستگی رہی۔ مختلف کورسز کی تدریس کے علاوہ کچھ لکھنے لکھانے کا کام بھی تھا۔ اسی دوران بیسیوں مضامین مرتب کیے۔ عام طور یہ مضامین سلسلہ وار ہوتے تھے تا کہ بعد میں انہیں کتابی صورت دی جا سکے۔ راقم کی اکثر کتابیں پہلے سلسلہ وار مضامین کی ہی صورت میں شائع ہوئی ہیں جیسا کہ چہرے کا پردہ: واجب، مستحب یا بدعت، مولانا وحید الدین خان: افکار و نظریات، فکر غامدی اور اسلام اور مستشرقین وغیرہ

تحریک تجدد اور متجددین کے عنوان سے یہ مضامین ماہنامہ میثاق، لاہور میں دسمبر 2010ء سے جولائی 2011ء کے دوران پبلش ہوئے۔ یہی مضامین ماہنامہ الاحرار، ملتان میں بھی جون 2010ء سے مئی 2011ء کے دوران شائع ہوئے۔ انہی مضامین کو اب افادہ عام کے لیے کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

منہج بحث و تحقیق

اس کتاب کا اسلوب تحقیقی نہیں رکھا گیا کہ ہر اہم بات کا حواشی میں مفصل حوالہ درج کیا جائے۔ یہ کتاب دراصل مصنف کا حاصل مطالعہ ہے کہ جسے تحریر کی صورت میں ڈھال دیا گیا ہے اور مطالعہ کے مصادر کو علیحدہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ جب یہ مضامین مجلہ میثاق اور مجلہ الاحرار میں شائع ہوئے تھے تو اس وقت تو ترتیب یہی تھی کہ ہر مضمون کے آخر میں اس کے مصادر و مراجع بیان کر دیے جاتے تھے۔ اور اب ان تمام مضامین کے مصادر و مراجع کو آخر کتاب میں اسی عنوان سے جمع کر دیا گیا ہے۔

یہ کتاب دراصل مصنف کی مستقل تحقیق نہیں ہے بلکہ اس میں یا تو دیگر مصنفین کی مستقل تحقیقات کو ملخص (summarize) کیا گیا ہے مثلاً غلام احمد پرویز پر پروفیسر

ڈاکٹر محمد دین قاسمی صاحب اور ماہنامہ محدث کا کام بہت عمدہ ہے لیکن وہ سینکڑوں صفحات میں پھیلا ہوا جبکہ ہر قاری کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ضخیم کتابوں کا مطالعہ کر سکے تو ہم نے ان مصادر سے دس صفحات کا ایک مضمون اس انداز میں مرتب کیا کہ جس سے پرویزی فکر کا پورا نقشہ قارئین کے سامنے آ جائے۔ یا پھر اس کتاب میں کسی موضوع پر پہلے سے موجود تحقیق پر اضافہ کیا گیا ہے جیسا کہ پروفیسر طاہر القادری صاحب پر جو مضمون اس کتاب میں شامل ہے، اس میں ان کے بارے کچھ نئی تحقیقات پیش کی گئی ہیں کہ جس کے لیے ہمیں ان کی تقریباً سوڈیڑھ سو کتابوں کو دیکھنا پڑا۔ تحقیق کا ایک مقصد تو تخلیق ہے۔ دوسرا مقصد پہلے سے موجود کسی تحقیق میں اضافہ کرنا ہے۔ اور تیسرا مقصد یہ بھی ہے کہ پہلے سے موجود تحقیق کو مخلص کر دیا جائے۔ یہ کتاب تحقیق کے دوسرے اور تیسرے مقصد کو پورا کرتی ہے۔

اس کتاب میں تین قسم کے لوگوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے وہ حضرات جن کے نظریات اور افکار میں اس قدر بگاڑ ہے کہ ان پر متجدد کا لفظ صادق آتا ہے۔ دوسرے نمبر پر وہ اہلِ علم کہ جن میں بعض فروعی مسائل کے اعتبار سے تو تجدد محسوس ہوتا ہے لیکن ان پر لفظ متجدد کا اطلاق صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

اظہار تشکر

میں آخر میں ریکٹر کامساٹس پروفیسر ڈاکٹر ایس ایم جنید زیدی صاحب، ڈائریکٹر لاہور کیمپس پروفیسر ڈاکٹر قیصر عباس صاحب اور ہیڈ آف ہیومینیٹیز ڈیپارٹمنٹ ڈاکٹر مدثر محمود صاحب کا بھی انتہائی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے یونیورسٹی میں بحث اور تحقیق کے لیے مطلوبہ وسائل اور ماحول کی فراہمی میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رکھی ہے۔

آخر میں، میں اپنی اہلیہ محترمہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کے تعاون اور حوصلہ افزائی سے یہ کتاب پایہ تکمیل کو پہنچ پائی۔

جزاکم اللہ خیرا

ابوالحسن علوی

باب اول

تحریک تجدد کی تاریخ

تجدد کی پہلی تحریک

پہلی صدی ہجری کے آخر میں ہی کئی ایسی شخصیات اور بدعتی گروہوں کا ظہور ہونا شروع ہو گیا تھا جو اسلام کی شاہراہ سے کٹ کر پگڈنڈیوں پر چلنا شروع ہو گئے تھے۔ معتزلی افکار اگرچہ معبد جہنی، غیلان دمشقی، جہم بن صفوان اور جعد بن درہم وغیرہ میں بھی پائے جاتے تھے، لیکن معتزلہ کا باقاعدہ ایک فرقے کے طور پر ظہور واصل بن عطاء غزال (۸۰ تا ۱۳۱ھ) کی سرکردگی میں ہوا۔ یہ شخص جلیل القدر تابعی حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا شاگرد تھا اور ایک دفعہ ایک مسئلے میں اُن سے اِس کا اختلاف ہو گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مؤمن ہے یا نہیں؟ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا کہنا یہ تھا کہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب فرد کا ایمان اس کے گناہ کی وجہ سے کم تو ہو جاتا ہے لیکن بالکل ختم نہیں ہوتا اور یہی صحابہ وتابعین کا عقیدہ ہے۔ جبکہ واصل بن عطاء کا موقف یہ تھا کہ جو مسلمان گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اس سے ایمان نکل جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جب اس سے ایمان نکل گیا ہے تو کیا وہ کافر ہو گیا؟ تو اس کا جواب اس نے یہ دیا کہ وہ کافر بھی نہیں ہوا۔ اب اس پر سوال یہ ہوا کہ نہ تو وہ مؤمن ہے اور نہ ہی کافر، تو پھر کیا ہے؟ اس کا جواب اس نے یہ دیا کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب "منزلة بين المنزلتين" پر ہے، یعنی وہ کفر اور ایمان کے مابین ایک مقام پر ہے اور اس مقام کو اس نے "منزلة بين المنزلتين" کا نام دیا۔ گویا اُس نے کفر اور ایمان کے مابین ایک ایسی نئی اصطلاح کا تعارف کروایا کہ جس کے مطابق ایک شخص میں نہ تو ایمان باقی رہتا ہے اور نہ ہی اس میں کفر داخل ہوتا ہے۔ اب اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ جب ایک شخص نے گناہ کبیرہ کیا اور اس سے ایمان بھی نکل گیا لیکن وہ کافر بھی نہ ہوا اور اس حالت میں اگر وہ فوت ہو جائے تو آخرت میں اس کا کیا معاملہ ہو گا؟ کیونکہ آخرت میں نجات تو ایمان ہی کی بدولت ہے اور وہ اس سے نکل چکا ہے اور ابھی اس نے توبہ بھی نہیں کی تھی کہ اس کا ایمان واپس آتا اور گناہ کے ارتکاب کے دوران ہی یا گناہ کرنے کے بعد بغیر توبہ کے اسے موت آ گئی تو اس کا اُخروی حکم کیا ہو گا؟ اس کا جواب واصل بن عطاء نے یہ دیا کہ ایسا شخص دائمی جہنمی ہے۔ بحث جب طول

پکڑ گئی تو اس شخص نے اپنے ساتھیوں کو لے کر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے حلقہ سے الگ اپنا ایک علمی حلقہ قائم کر لیا۔ اس پر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: "اعتزل عنا واصل "یعنی واصل ہم سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ اسی سے ان کا نام معتزلہ پڑ گیا۔[1]

معتزلہ کے اصولِ خمسہ:

رفتہ رفتہ معتزلہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور یہ خود کئی ایک فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور ہر فرقے نے اپنے بدعتی افکار کی ایک فہرست بنالی اور اس کو نقل و عقل سے ثابت کرنا شروع کر دیا، لیکن ان کے تقریباً تمام فرقوں میں پانچ اصولوں پر اتفاق ہی رہا ہے اور یہی پانچ اصول معتزلہ کی پہچان بن گئے۔ یہ پانچ اصول درج ذیل ہیں:

- **توحید:** اپنے اس اصول کے تحت انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم مان لیں کہ اللہ بھی سنتا ہے اور انسان بھی سنتا ہے، اللہ بھی دیکھتا ہے اور انسان بھی دیکھتا ہے تو اس صورت میں اللہ کی صفات انسان میں بھی پائی جائیں گی، لہٰذا صفات کا شرک لازم آئے گا۔ پس انسان کے بارے میں تو یہ معلوم ہے کہ وہ کلام کرتا ہے، سنتا ہے، دیکھتا ہے اور اس کی ان صفات کا انکار ممکن نہیں ہے۔ اور اللہ کے بارے جب کتاب و سنت میں اس کی ایسی صفات کا تذکرہ آئے تو ان کی ایسی تاویل کرو کہ ان صفات کا انکار لازم آئے تاکہ انسان اور اللہ میں مشابہت نہ ہو۔ پس انہوں نے اللہ کی صفت سماعت، بصارت، کلام، ارادہ، حیات، قدرت حتیٰ کہ جمیع صفات کا انکار کر دیا۔

اہل سنت کا کہنا یہ ہے کہ اگر اللہ کی صفات کا انکار کر دیا جائے تو پھر ایک اندھے، بہرے اور گونگے خدا کو ماننا لازم آئے گا اور اس صورت میں ہندوؤں کے بتوں، مشرکین کے معبودوں، کافروں کے اوتاروں، مادہ پرستوں کے اندھے بہرے مادے اور مسلمانوں کے خدا میں کیا فرق باقی رہ جائے گا؟ اہل سنت کہتے ہیں کہ ہم اللہ کی جمیع

[1] الموسوعة الميسرة: 64/1

صفات کو تو مانتے ہیں لیکن ہم ان صفات کی نہ تو کیفیت بیان کرتے ہیں اور نہ ہی ان کو انسانوں کی صفات کے مماثل قرار دیتے ہیں، نہ ہی ان میں تحریف کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں عقلی و منطقی بحثوں کے دروازے کھولتے ہیں۔ بس جتنا کتاب و سنت نے بیان کر دیا ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے بارے میں کج بحثی نہیں کرتے۔ قرآن میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کلام کرتا ہے۔ بس ہم اللہ کی صفت کلام پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن اس کی کیفیت کیا ہے؟ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔ اس کے برعکس معتزلہ کا منہج یہ ہے کہ وہ سوال در سوال پیدا کرتے ہیں، مثلاً وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مان لیں کہ اللہ تعالیٰ کلام کرتا ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کا ایک منہ بھی ہو گا یا اس کی زبان بھی ہو گی، معاذ اللہ! کیونکہ اس کے بغیر تو کلام ممکن نہیں ہے۔ اور اگر ہم اس کا منہ اور زبان مان لیں تو اس سے اللہ کا جسم لازم آئے گا۔ پس معتزلہ اس کج بحثی میں بڑھتے بڑھتے اللہ کی صفات کا ہی سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی صفات کتاب و سنت سے معلوم ہیں اس لیے ان کو ماننا اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے، البتہ ان کی کیفیت مجہول ہے، لہٰذا اس کے بارے گفتگو نہیں کرنی چاہیے اور جو شخص ان صفات کی کیفیات کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو وہ بدعتی ہے۔ امام اہل سنت، امام مالک رحمہ اللہ سے جب اللہ کے عرش پر مستوی ہونے کے بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے اس کا یہ جواب دیا:

"الاستواء غير مجهول والكيف غير معقول والإيمان به واجب والسؤال عنه بدعة."[1]

"اللہ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت عقل میں نہیں آ سکتی اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے سوال کرنا بدعت ہے۔"

یعنی اہل سنت اسی پر خاموش ہو جاتے ہیں جو کتاب و سنت نے بیان کر دیا ہے اور اس پر اگر کوئی سوال کرے تو وہ اہل سنت سے خارج ہو کر اہل بدعت میں شامل ہو جاتا ہے، کیونکہ سوال سے کج بحثیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ امام اہل سنت، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے

[1] الاسماء والصفات للبیہقی: 305/2

ہیں:

"وله يد و وجه ونفس كما ذكره الله تعالى في القرآن، فما ذكره الله تعالى في القرآن من ذكر الوجه واليد والنفس فهو له صفات بلا كيف ولا يقال: أن يده قدرته او نعمته لان فيه إبطال الصفة وهو قول أهل القدر والاعتزال."[1]

"اللہ تعالیٰ کا ہاتھ، چہرہ اور نفس ہے، جیسا کہ اُس نے اِس کا قرآن میں اثبات کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے جو قرآن میں اپنے لیے چہرے، ہاتھ اور نفس کا اثبات کیا ہے تو یہ اللہ کی صفات ہیں۔ ان صفات کی کیفیت نہیں بیان کی جائے گی اور نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ اللہ کے ہاتھ سے مراد اس کی قدرت یا نعمت ہے، کیونکہ ایسا کہنے سے اللہ کی صفت کا انکار لازم آئے گا اور ایسا تو قدریہ اور معتزلہ کہتے ہیں [یعنی ایسی تاویل کرنا اہل سنت کا منہج نہیں ہے]۔"

- **عدل:** اس اصول کے مطابق معتزلہ کا کہنا یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا فاعل بھی ہے اور خالق بھی، جبکہ اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے فعل کا فاعل تو ہوتا ہے لیکن اس کے فعل کا خالق اللہ کی ذات ہی ہوتی ہے۔ اہل سنت کے عقیدے کے مطابق خیر و شر دونوں کا خالق اللہ کی ذات ہے، جبکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ شر کا خالق اللہ کی ذات ہے تو اس سے شر کی نسبت اللہ کی طرف ہو گی جو عقلاً درست نہیں ہے۔ اہل سنت اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ کسی کام کو کرنے کے اعتبار سے فعل کی نسبت فاعل کی طرف ہوتی ہے۔ پس شر کا فاعل انسان ہے لہٰذا اس کی نسبت انسان کی طرف ہو گی ، لیکن اس شر کا خالق اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے۔

اہل سنت اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی دو قسمیں بناتے ہیں: ارادہ شرعیہ اور ارادہ کونیہ۔ ارادہ شرعیہ کا تعلق اللہ کے مطالبے سے ہے اور دوسرے الفاظ میں یہی شریعت کہلاتا ہے، جبکہ ارادہ کونیہ کا تعلق اللہ کی تخلیق سے ہے۔ اس کو ایک سادہ سی مثال سے یوں

---

[1] الفقه الأكبر: ص 27

سمجھیں کہ ابلیس شر تو ہے لیکن اس شر کا خالق تو اللہ ہی ہے۔ یعنی اس کائنات میں ہر ہر چیز کا خالق اللہ کی ذات ہے، یہ اہل سنت کا عقیدہ ہے، جبکہ معتزلہ کے نزدیک انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کے افعال کا خالق نہیں ہے۔

اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ انسان جب کسی فعل کا فاعل بنتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کی تخلیق فرماتا ہے، مثلاً انسان برائی کرتا ہے تو انسان اس کا فاعل ہے اور اللہ تعالیٰ اس برائی کو وجود بخشتا ہے، لہٰذا اللہ اس کا خالق ہے۔ اگر انسان فاعل بنے اور اللہ خالق نہ بنے تو اس شے کا وجود اس دنیا میں قائم نہیں ہوتا، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل رحمہ اللہ پر چھری چلادی اور ان کو ذبح کرنے کے فاعل بن گئے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے اس فعل کے خالق نہ بنے، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فعل یعنی ''ذبحِ اسمٰعیل'' کو وجود نہ ملا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [الصافات: 96]

''اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو بھی۔''

- **وعد و وعید:** اپنے اس اصول کے تحت معتزلہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق فرمانبردار کو جزا دے اور نافرمان کو سزا دے۔ چنانچہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو معاف کرے۔ یہ بات اللہ کے عدل کے منافی ہے۔ اہل سنت کے نزدیک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ کسی گناہ گار کو معاف کردے اور اسے سزا نہ دے، چاہے اُس نے توبہ کی ہو یا نہ کی ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ [النساء: 48]

''بے شک اللہ تعالیٰ اس کو کبھی معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کمتر گناہ جس کے لیے چاہے گا، معاف کردے گا۔''

- **منزلۃ بین المنزلتین:** اس اصول کے مطابق معتزلہ کا کہنا یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا

مرتکب ایمان سے نکل جاتا ہے اور کفر میں داخل نہیں ہوتا، للذا نہ تو وہ مؤمن ہے اور نہ ہی کافر ہے، جبکہ آخرت کے اعتبار سے وہ دائمی جہنمی ہے۔ معتزلہ اور خوارج میں اس مسئلے میں فرق یہ ہے کہ خوارج اسے دنیا میں بھی کافر شمار کرتے ہیں اور آخرت میں دائمی جہنمی، جبکہ معتزلہ دنیا میں تو اسے کافر نہیں کہتے لیکن اس کی آخرت کے بارے میں وہی حکم لگاتے ہیں جو کفار کا ہے۔

- **امر بالمعروف و نہی عن المنکر:** اپنے اس قول کے تحت انہوں نے اسلام کی نشر واشاعت، گمراہوں کی ہدایت اور بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب قرار دیا ہے۔ اگرچہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اہل سنت کے نزدیک بھی فرض ہے، لیکن معتزلہ نے نہی عن المنکر کے اعلیٰ ترین یعنی ہاتھ سے منکر کو تبدیل کرنے کے بارے میں غلو سے کام لیا ہے۔ اپنے اس اصول کے تحت انہوں نے ظالم، فاسق اور حق سے منحرف حکمرانوں کے خلاف خروج کو واجب قرار دیا ہے اور حق سے انحراف سے مراد ان کی یہ ہے کہ جو حکمران ان کے بدعتی افکار کا قائل نہ ہو، وہ بھی حق سے منحرف شمار ہو گا اور اس کے خلاف خروج واجب ہو گا۔ اہل سنت کے نزدیک ظالم اور فاسق حکمران کے خلاف خروج کے بارے میں تفصیل ہے، جسے ہم نے ایک دوسرے مقام پر تفصیل سے واضح کر دیا ہے۔

عصر حاضر کی تحریک تجدد:

معاصر تحریک تجدید کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ جب اسلام سیاسی طور پر مغلوب ہو گیا اور مسلمان ممالک کی ایک بڑی تعداد اہل یورپ کی کالونیاں بن گئیں تو مغرب میں جاری روشن خیالی اور احیائے علوم (enlightenment and renaissance) کی مذہب بیزار تحریک کے جراثیم ایک متعدی بیماری کی طرح مقبوضہ مسلمان ممالک میں بھی منتقل ہوئے۔ مسلمان اُمت کا ایک بہت بڑا، ذہین اور متحرک طبقہ اس تحریک سے متاثر ہوا اور اس نے دین اسلام کی ایسی ایسی تعبیرات اور

تشریحات پیش کیں کہ جنہوں نے اس دینِ توحید کے عقائد اور بنیادوں کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا اور دین اسلام کا ایک ایسا جدید ایڈیشن تیار کیا جو علمائے یورپ کے توہمات پر تو سو فی صد پورا اترتا تھا لیکن اس میں محمد رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا اسلام ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا تھا۔

مسلمانوں کی غلامی کے اس دور میں جہاں ایک طرف انگریز اور اہل یورپ سے آزادی کے لیے سیاسی، عسکری اور انقلابی اسلامی تحریکوں نے جنم لیا وہاں دوسری طرف یورپ کی جاہلیت جدیدہ سے مرعوب متجددین کے مسخ شدہ تصورات پر نقد اور دین اسلام کی حقیقی و صحیح تصویر کو سامنے لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے علماء اور اہل علم حضرات کی ایک جماعت کو مسند ارشاد پر سرفراز کیا۔ ذیل میں ہم پچھلی ڈیڑھ صدی میں تجدد پسندی کی اس تحریک کے دین اسلام پر ڈالے گئے حجابات کا ایک مختصر جائزہ لیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ ان متجددین کے ہاں اُمت کے متفق علیہ مسلمہ عقائد سے انحراف کے مقامات کو بھی واضح کریں گے۔ ہماری یہ گفتگو مصر، ترکی اور برصغیر پاک وہند کے متجددین اور ان کے افکار و نظریات تک محدود رہے گی کیونکہ اس دَور میں یہی ممالک اُمتِ مسلمہ کی قیادت کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ اس موضوع پر تفصیلی کلام سے پہلے یہ بات واضح رہے کہ اس تحریر میں ہم دو قسم کے لوگوں کے حالاتِ زندگی اور افکار کا تذکرہ کریں گے:

- وہ حضرات جن کے نظریات اور افکار میں اس قدر بگاڑ ہے کہ ان پر متجدد کا لفظ صادق آتا ہے۔
- وہ اہلِ علم کہ جن میں بعض فروعی مسائل کے اعتبار سے تو تجدد محسوس ہوتا ہے لیکن ان پر لفظ متجدد کا اطلاق صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

باب دوم

مصر میں جدیدیت کی تحریک

مصر میں جدیدیت کی تحریک

مصر میں جدیدیت کی تحریک کے بارے میں بحث کو ہم تین ذیلی حصوں میں تقسیم کر رہے ہیں:

- ❖ **مصلحین امت:** جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، رشید رضا وغیرہ
- ❖ **ادباء و شعراء:** طٰہٰ حسین، توفیق الحکیم وغیرہ
- ❖ **شیخین:** علامہ یوسف قرضاوی اور وہبۃ الزحیلی کا مسئلہ

سید جمال الدین افغانی

سید جمال الدین افغانی ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے اور ۹ مارچ ۱۸۹۷ء میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ سید جمال الدین افغانی یا سید جمال الدین اسد آبادی کے نام سے معروف تھے۔ ان کی نسبت میں تذکرہ نگاروں کا بہت زیادہ اختلاف ہے۔ ان کو جمال الدین استنبولی، جمال الدین اسد آبادی، جمال الدین حسینی، جمال الدین افغانی، جمال الدین طوسی اور جمال الدین رومی وغیرہ جیسی نسبتوں سے منسوب کیا گیا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سید جمال الدین جس ملک یا شہر کا سفر کرتے تھے، وہاں قیام کے دوران اسی علاقے کی طرف اپنی نسبت کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اس قدر نسبتیں منقول ہیں۔ سید جمال الدین افغانی کی یہ بھی عادت تھی کہ جس علاقے میں بھی جاتے، وہاں کے علماء کی وضع قطع اختیار کر لیتے۔ مثلاً ایران میں اپنے قیام کے دوران وہ شیعہ علماء کی مناسبت سے کالا عمامہ باندھتے تھے، ترکی اور مصر میں سفید عمامہ پہنتے، یورپ میں بعض اوقات صرف ٹوپی اور حجاز میں عربی عقال باندھتے تھے۔

ان کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے نزدیک وہ ایران میں ''ہمدان'' کے قریب ایک مقام ''اسد آباد'' میں پیدا ہوئے، جبکہ کچھ دوسرے مؤرخین کا کہنا ہے کہ ان کی جائے پیدائش افغانستان کا صوبہ ''کنڑ'' ہے اور اس صوبے میں ''اسعد آباد'' نامی جگہ پر ان کی پیدائش ہوئی۔ ان دونوں موقفات میں سے حقائق سے قریب تر بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی جائے پیدائش ایران ہے اور

انہوں نے ایک شیعہ مسلم کے طور پر اپنا بچپن گزارا۔ ان کے والد سید صفدر حسینی سادات میں سے تھے اور ان کا نسب نامہ عمر بن علی زین العابدین بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم تک جا پہنچتا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ انہوں نے ایرانی بادشاہ ''ناصر الدین شاہ'' کے عتاب اور اثر سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو افغانی اور سنی مسلم کے طور پر متعارف کروایا۔

سید جمال الدین افغانی کا مسلک:

انہوں نے ابتدائی تعلیم ایران کے شہر ''قزوین'' میں حاصل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے تہران اور اس کے بعد عراق کا سفر کیا۔ ان کے مشائخ میں اکثر و بیشتر شیعہ علماء شامل ہیں، مثلاً آغا خان صادق، شیخ مرتضیٰ، قاضی بشر، حافظ دراز اور حبیب اللہ قندھاری وغیرہ۔ ڈاکٹر عبد النعیم محمد حسنین نے ''جمال الدين أسد أباذي'' نامی کتاب کے مقدمہ میں سید جمال الدین افغانی کو ''متعصب اثنا عشری شیعہ'' قرار دیا ہے اور اس کے بارے میں کئی ایک حقائق اور قرائن نقل کیے ہیں۔ شیخ عبد اللہ عزام نے اپنی کتاب ''القومية العربية'' میں سید جمال الدین افغانی پر ''اثنا عشری شیعہ'' ہونے کا الزام لگایا ہے۔ شیخ محمد حسین نے تو ان کے شیعہ ہونے پر متعدد دلائل بھی نقل کیے ہیں۔ ڈاکٹر سفر الحوالی نے بھی انہیں شیعہ قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر محمد عمارہ نے اپنی کتاب ''جمال الدين الأفغاني موقظ الشرق وفيلسوف الإسلام'' میں ان کے شیعہ ہونے کا انکار کیا ہے اور اس کے دلائل بھی نقل کیے ہیں۔ روم، میں ایران کے سفیر سید ہادی خسرو شاہی نے بھی اپنی کتاب ''الآثار الكاملة للأفغاني'' میں ان کے شیعہ ہونے کا انکار کیا ہے۔ شیخ رشید رضا نے بھی اپنی کتاب ''تاريخ الأستاذ الإمام'' میں لکھا ہے کہ ان کے استاذ مفتی محمد عبدہ رحمہ اللہ کی رائے اہل تشیع کے بارے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے بھی سخت تھی اور مفتی محمد عبدہ رحمہ اللہ اپنے استاذ سید جمال الدین افغانی سے حد درجے محبت رکھتے تھے، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جمال الدین افغانی شیعہ نہ تھے۔ سید جمال الدین افغانی نے اپنی

کتاب "خاطرات" میں اپنے آپ کو حنفی سنی مذہب کا پیروکار، جو صوفیت کی طرف مائل ہے، بتلایا ہے۔ ڈاکٹر محسن عبد الحمید نے بھی اپنی کتاب "جمال الدين الأفغاني المصلح المفترى عليه" میں انہیں سنی حنفی مذہب کا متبع قرار دیا ہے۔

سیاسی زندگی:

جنگ آزادی کا سال یعنی ۱۸۵۷ء جمال الدین افغانی نے دہلی میں گزارا اور حج کی ادائیگی کے بعد ۱۸۵۸ء میں افغانستان منتقل ہو گئے۔ وہاں وہ افغانی بادشاہ دوست محمد خان کے مشیر خاص بن گئے اور اس کے بعد اگلے حکمران محمد اعظم کے بھی مشیر رہے۔ انہوں نے افغانی حکمران دوست محمد خان کو برطانیہ کی نسبت روس سے تعلقات قائم کرنے کا مشورہ دیا جس کی وجہ سے برطانوی حکومت ان کے خلاف ہو گئی اور ان کو روسی جاسوس قرار دیا۔ ۱۸۶۸ء میں کابل پر شیر علی خان کے قبضے کے بعد سید جمال الدین کو افغانستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ۱۸۷۱ء میں انہوں نے مصر کا رخ کیا اور سیاسی اصلاح کا نظریہ عام کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے نوجوانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد کو اپنے افکار و نظریات سے متاثر کیا جن میں سے نمایاں نام مفتی محمد عبدہ کا ہے۔ ان پر شدت پسندی کا الزام لگا کر انہیں ۱۸۷۹ء میں مصر سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے استنبول، لندن، پیرس، ماسکو، سینٹ پیٹر برگ اور میونخ وغیرہ کا سفر کیا۔ ۱۸۸۴ء میں انہوں نے پیرس میں "عروۃ الوثقیٰ" کے نام سے ایک عربی اخبار کا اجرا کیا۔ سید جمال الدین افغانی کی جملہ تقاریر اور تحریروں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دعوت درج ذیل چار نکات کے گرد گھومتی تھی اور یہی نکات ان کی دعوت کا مرکز و محور تھے:

- اسلامی ممالک پر مغربی تسلط و غلبے پر تنقید
- مسلمان ممالک کے باہمی اتحاد و اتفاق کی تحریک
- مسلمانوں میں جدید مغربی سائنسی علوم کے حصول کی رغبت پیدا کرنا
- ایک ایسے ادارے کے قیام کی کوشش جو اسلام کو ایک مضبوط طاقت بنا دے

جمال الدین افغانی کے ہاں ایسے افکار نہیں ملتے جس سے یہ محسوس ہوتا ہو کہ وہ اسلامی ممالک میں جمہوری سیاسی نظام یا پارلیمانی نظام کے قیام کے داعی ہوں، بلکہ ان کی اصل نقد اپنے دور کے مسلمان حکمرانوں پر تھی جنہیں وہ مغرب کے نمائندے قرار دیتے تھے۔ جمال الدین افغانی کی کوششیں مغرب کے پیروکار مقامی مسلمان حکمرانوں کو ہٹانے اور ان کی جگہ قوم پرست اور محب وطن مسلمان امراء کو حکومت دلوانے کے لیے تھیں۔

افکار و نظریات:

احمد امین مصری کے بقول، جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب "زعماء الإصلاح في العصر الحديث" میں واضح کیا ہے، سید جمال الدین افغانی پر اس وجہ سے الحاد کا فتویٰ لگایا گیا کہ انہوں نے نبوت کو ایک کسبی چیز قرار دیا تھا۔ ترکی کے شیخ الاسلام حسن افندی فہمی نے ان کے تصورِ نبوت پر کڑی تنقید کی اور ائمہ مساجد اور واعظین کو یہ ہدایت جاری فرمائی کہ وہ ان کے خلاف اس قدر بولیں کہ انہیں ترکی چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ بالآخر ترکی سے انہوں نے مصر کا رُخ کیا۔ مصر میں بھی شیخ محمد علیش نے ان پر ان کے تصوراتِ نبوت کی وجہ سے الحاد کا فتویٰ لگایا۔

سید جمال الدین افغانی کے ایک عیسائی شاگرد سلیم عنجوری نے اپنی کتاب "سحر هاروت" میں لکھا ہے کہ جمال الدین افغانی عالم کے قدیم ہونے اور محرکِ اوّل کے وجود وغیرہ جیسی فلسفیانہ الحادی تعبیرات کے قائل تھے۔ مفتی محمد عبدہٗ کے شاگرد شیخ رشید رضا کے بیان کے مطابق، جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب "تاريخ الأستاذ الإمام" میں بیان کیا ہے، جمال الدین افغانی نظریہ وحدت الوجود کی طرف مائل تھے اور اس مسئلے میں ان کا کلام صوفیاء کے باطنی فرقے سے ملتا جلتا ہے۔ جمال الدین افغانی کے ایک شاگرد ادیب اسحاق کا کہنا بھی یہی ہے کہ شروع زندگی میں جمال الدین افغانی تصوف اور صوفیت کی طرف مائل تھے اور خلوت کے ذریعے حقیقت کا ادراک کرنے کی کوشش کرتے تھے، لیکن آخر عمر میں وہ فلسفے اور عقل کی طرف زیادہ مائل ہو گئے تھے۔ جمال

الدین افغانی کے ایک اور شاگرد سلیم صحوری نے بیان کیا ہے کہ جمال الدین افغانی نے ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران ہندو برہمن علماء سے استفادہ کیا اور سنسکرت میں کمال حاصل کر لیا۔ شاید انہی برہمن علماء کے زیر اثر انہوں نے اس عالم کے قدیم ہونے کا قول اختیار کیا۔

سید جمال الدین افغانی کا خیال تھا کہ اسلام کے جملہ عقائد و نظریات عقل سلیم کے مطابق ہیں اور انہوں نے ۱۸۸۱ء میں دہریت کے رد پر ایک کتاب "الردّ علی الدھریین" [Refutation of the Materialists] کے نام سے شائع کی۔ ابتداء میں وہ ارتقاء کے نظریے کے خلاف تھے اور انہوں نے ڈارونزم کا سختی سے رد کیا، لیکن بعد میں جانوروں میں تو نظریہ ارتقاء کے قائل ہو گئے، لیکن انسانوں میں ان کے ذی روح ہونے کی وجہ سے قائل نہ تھے۔ جمال الدین افغانی سماوی ادیان میں مودّت و محبت اور بحث و مباحثہ کے علمبردار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قریبی معاونین اور شاگردوں میں مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور عیسائی بھی ہیں، جیسا کہ یعقوب صنوع [یہودی]، ابو نظارہ اور سلیم عنجوری [نصرانی] وغیرہ۔ اسی تقریب بین الادیان کی خواہش کے پیش نظر وہ عالمی ماسونی تحریک کے بھی ایک عرصے تک رکن رہے۔ سید جمال الدین افغانی شیعہ سنی اتحاد کے بھی داعی تھے اور اسے وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھتے تھے۔

شیخ رشید رضا نے اپنی کتاب "تاریخ الأستاذ الإمام" میں لکھا ہے کہ سید جمال الدین افغانی تھوڑی بہت شراب بھی پی لیا کرتے تھے۔ شاید وہ بعض ہم عصر اسکالرز کی طرح اس بات کے نظریاتی طور پر قائل ہوں کہ جتنی شراب سے نشہ نہ ہو، اس کے پی لینے میں کوئی حرج نہیں یا شاید وہ شراب کی کوئی ہلکی قسم ہو جس سے نشہ نہ ہوتا ہو۔ اگر تو یہ ان کی ایک عملی کوتاہی تھی تو پھر تو اس کا تذکرہ مناسب معلوم نہیں ہوتا لیکن اگر وہ اس کو شرعاً جائز سمجھتے تھے تو یہ ایک گمراہی ہے جس پر شدید نکیر کی ضرورت ہے۔ ہم نے یہاں اس کا تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ سید جمال الدین افغانی پر لکھی گئی کتب میں ان کے اس فعل کا تذکرہ ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ ان کے شاگرد ادیب اسحاق نے لکھا

ہے کہ وہ کثرت سے تمباکو نوشی بھی کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب! مصطفی فوزی بن عبد اللطیف غزال نے اپنی کتاب "دعوة جمال الدين الأفغاني في ميزان الإسلام" میں ان مسائل کے بارے تفصیلی گفتگو کی ہے۔

سید جمال الدین افغانی ایک سیاسی آدمی تھے اور انہوں نے در حقیقت سیاسی زندگی ہی گزاری ہے اور اپنی زندگی میں سوائے چند ایک مضامین یا لیکچرز کے ان کا کوئی علمی کام ہمیں نہیں ملتا۔ ان کے لیکچرز بھی اکثر و بیشتر سیاسی، دعوتی اور فکری نوعیت کے ہوتے تھے۔ انہوں نے قرآن کی چند ایک آیات کی تفسیر بھی کی ہے۔ ان کی بعض آیات کی تفسیر سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر میں جدیدیت کی طرف مائل تھے۔ اگرچہ اس بارے میں ان کی کوئی لمبی چوڑی تحریر تو ہمیں نہیں ملتی لیکن ان کے تفسیری کلام میں ایسے اشارے موجود ہیں کہ وہ قرآن کی سائنسی تعبیر و تشریح کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ ڈاکٹر فہد بن عبد الرحمن سلیمان رومی نے اپنی کتاب "منهج المدرسة العقلية الحديثية في التفسير" میں ان کا تفسیری کلام اور اس پر نقد نقل کی ہے۔ ۹ مارچ ۱۸۹۷ء میں ان کی استنبول میں وفات ہوئی اور وہیں ان کی تدفین ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں افغان حکومت کی درخواست پر ان کی بچی کھچی اشیاء کابل یونیورسٹی میں منتقل کر دی گئیں جہاں ان کے لیے ایک مقبرہ بھی تعمیر کیا گیا۔

خلاصۂ کلام:

سید جمال الدین افغانی کے بارے میں لکھی گئی کتب اور مقالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں مثبت اور منفی دونوں قسم کی آراء موجود ہیں۔ ان کے دفاع میں بھی علماء کی کتب موجود ہیں اور ان کے خلاف بھی۔ چند ایک کتابوں کا تعارف ہم نے آخر میں مصادر و مراجع کے عنوان کے تحت نقل کر دیا ہے۔ سید جمال الدین افغانی کے شاگرد مفتی محمد عبدہٗ نے لکھا ہے کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے بارے میں علماء دو حصوں میں منقسم ہو چکے تھے۔ مفتی محمد عبدہٗ کے بقول ان کی زندگی میں ہی بہت سے علماء نے ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ مسلمان ممالک میں جابر عادل، حکمران کی

حکمرانی کے داعی ہیں۔ جب سید جمال الدین افغانی سے مفتی محمد عبدہٗ نے اس بارے وضاحت چاہی تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ مجھ پر الزام ہے کہ میں اس فکر کا داعی ہوں اور یہ تو دو متضاد صفات ہیں، میں ان کا داعی کیسے ہو سکتا ہوں؟

بہر حال جمال الدین افغانی پر لکھی گئی کتب اور مقالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک شخص اس نتیجے تک باآسانی پہنچ سکتا ہے کہ صوفیت، جو موسیقی اور رقص و سرود کو قوالی کے نام پر جائز قرار دیتی ہو، وحدت الوجود اور اسلام کی عقلی تعبیر ان کی فکر میں نمایاں تھی اور وہ اس کے داعی بھی تھے۔ اس کا اثبات ان کی اپنی تحریروں اور ان کے شاگردوں کے بیانات سے بھی ہوتا ہے۔ ان کی فکر کے انہی گوشوں کی وجہ سے عرب سلفی علماء ان پر شدید نقد کرتے ہیں۔ ہمیں بھی ان سلفی علماء کی تنقید سے اتفاق ہے۔ جہاں تک ان کے شیعہ ہونے کا معاملہ ہے تو اس کے دلائل تو قوی ہیں کہ وہ شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے اور انہوں نے شیعہ اساتذہ سے پڑھا لیکن کیا اس کے بعد انہوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ سلفی اور بعض حنفی علماء کا کہنا ہے کہ وہ تقیہ کرتے تھے اور اپنے آپ کو حنفی مذہب کا پیروکار کہلواتے تھے جبکہ حنفیہ کی اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ وہ حنفی مذہب کے پیروکار تھے۔ اہل تشیع میں سے بعض ان کو شیعہ اور بعض حنفی کہتے ہیں۔ بہر حال اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ شیعہ سنی اتحاد کے خواہاں تھے۔ ہمارے نزدیک اس مسئلے میں ان کی اپنی وضاحت معتبر ہے اور اسلام ظاہر کا ہی اعتبار کرتا ہے، باطن کا معاملہ تو اللہ کے پاس ہے اور ان کی اپنی وضاحت یہ ہے کہ وہ حنفی سنی مسلمان ہیں۔

سگریٹ نوشی ان کی عادتِ ثانیہ تھی، جو ایک قبیح عادت تصور کی جاتی ہے۔ اگرچہ اس میں حنفیہ کے بقول نشہ کا پہلو غالب نہ بھی ہو لیکن اسراف و تبذیر اور ہلاکتِ نفس دونوں ہی شامل ہیں، یعنی دوسرے الفاظ میں سگریٹ نوشی اپنے ہی مال و جان کو آگ لگانے کے مترادف ہے اور یہ حرام ہے، اور انہی بنیادوں پر سعودی علماء نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ نبوت کے کسبی ہونے یا جانوروں میں ارتقاء یا فنونِ لطیفہ کے جائز ہونے یا

قرآن کے بعض مقامات کی تفسیر میں سائنسی ایجادات کے حوالے دینے وغیرہ جیسے تصورات ان کے بعض لیکچرز میں موجود ہیں اور ان افکار کی وجہ سے ان پر معاصر علماء کی طرف سے نقد بھی ہوئی ہے، لیکن اس بارے میں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے اپنے ان نظریات سے رجوع کر لیا تھا یا وہ ان پر قائم تھے۔ بہر حال یہ ان کے ایسے تصورات ہیں جو غلط تو ہیں ہی، البتہ انہیں جدیدیت کے اثرات میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کا براہِ راست تعلق سائنس اور مغربی تہذیب سے جڑتا ہے۔

ان کی زندگی کا سیاسی پہلو جو انہوں نے مغربی تسلط اور ان کے نمائندہ مسلمان حکمرانوں سے آزادی کے لیے گزارا ہے اور اس کے لیے جو کوششیں کی ہیں، لائقِ تحسین ہیں۔ در حقیقت ان کی اصل زندگی سیاسی ہی تھی اور سیاست کی اصلاح ہی کو وہ مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے، جبکہ اس مسئلے میں ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہٗ کو ان کی فکر سے اختلاف تھا۔ وہ بھی مسلمانوں کی اصلاح کے خواہاں تھے لیکن وہ تعلیم کو اصلاح کا اصل ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی زندگی سیاسی کی بجائے تعلیمی میدان میں گزاری۔ بحیثیت مجموعی سید جمال الدین افغانی عالم اسلام کی سیاسی اصلاح و فلاح کے لیے ایک مصلح کے طور پر کام کرتے رہے اور ان کی مثال ہمارے نزدیک ایسی ہی ہے جیسا کہ بر صغیر پاک و ہند میں علامہ اقبال رحمہ اللہ کی ہے۔ اقبال رحمہ اللہ بلاشبہ ایک مفکر اُمت مسلمہ کا درد رکھنے والے اور مصلح تھے، لیکن ان کے بعض نظریات اور افکار اُمتِ مسلمہ کے متفق علیہ مسلمہ عقائد کے منافی تھے۔ یہی معاملہ سید جمال الدین افغانی کا بھی ہے۔ ایسے مصلحین کی ذات اور صفات کو رگیدنے کی بجائے ان کے بدعتی نظریات کا علمی جائزہ لینا چاہیے۔ اس لیے ہمیں ان بعض سلفی علماء سے اتفاق نہیں ہے جو سید جمال الدین افغانی کو رافضی، خبیث یا انگریز کا ایجنٹ وغیرہ جیسے القابات سے نوازتے ہیں۔ ہاں، اس بات کے ہم ضرور قائل ہیں کہ جمال الدین افغانی کے عقائد اور نظریات میں بگاڑ اور فساد موجود ہے جس کا پُر زور رد ہونا چاہیے، چہ جائیکہ ہم ان کی نیتوں کا فیصلہ کرتے ہوئے انہیں رافضی یا یہود کا ایجنٹ قرار دیں۔ واللہ اعلم بالصواب!

مفتی محمد عبدہٗ

ان کا مکمل نام محمد بن عبدہ بن حسن بن خیر اللہ ہے۔ ۱۲۶۵ھ بمطابق ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ محلے کی ایک مسجد میں ہی صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، لیکن ان کے بقول تقریباً دو سال کے عرصے میں انہیں نحو کا ایک لفظ بھی سمجھ نہ آیا۔ اس کا الزام وہ مدارس کے قدیم نصاب اور طریقۂ تعلیم کو دیتے تھے۔ ۱۲۸۲ھ میں تقریباً ۱۷ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ شادی کے بعد ان کے والد نے انہیں پھر ایک قدیم مدرسے میں زبردستی تعلیم کے لیے بھیج دیا جس سے وہ راستے میں ہی بھاگ گئے۔ ان کے بقول مدارس کے قدیم نصابِ تعلیم اور طریقہ تدریس نے ان میں مذہبی تعلیم سے بیزاری اور بغاوت پیدا کر دی تھی اور اس قدیم نصاب اور طریقۂ تعلیم سے ۹۵ فی صد سے زائد طلبہ کچھ حاصل نہ کر پاتے تھے۔ وہ اس نصابِ تعلیم اور طریقہ تدریس میں انقلابی تبدیلیوں کے قائل تھے۔ اسی دوران وہ اپنے ایک چچا شیخ درویش کے ہاتھ لگ گئے جو تصوف کی راہ کے مسافر تھے، جنہوں نے ان کی روحانی تربیت کی اور انہیں دوبارہ مذہبی تعلیم کی طرف متوجہ کیا اور ان میں اس کا ذوق و شوق بیدار کیا۔ انہوں نے اپنے شیخ اور چچا کی رہنمائی میں سلوک کی کئی منازل طے کیں اور اپنے کئی ایک روحانی تجربات بھی بیان کیے ہیں۔

۱۲۸۷ھ میں سید جمال الدین افغانی کی قاہرہ آمد پر ان سے ریاضی، فلسفہ اور علم کلام کی تعلیم حاصل کی اور ان کے طرز تدریس اور افکار سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہی کے ہو کر رہ گئے۔ ۱۸۶۶ء میں جامعہ ازہر سے تعلیم کے لیے منسلک ہوئے اور ۱۲۹۴ھ بمطابق ۱۸۷۷ء میں جامعہ ازہر سے شہادۃ العالمیہ کا امتحان پاس کیا۔ جامعہ ازہر میں تعلیم کے حصول کے دوران بھی ان پر تصوف، عبادت اور مجاہدۂ نفس کا غلبہ رہا۔ وہ ساری ساری رات عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے بقول انہیں جذب و کشف کی اس دنیا سے ان کے استاذ سید جمال الدین افغانی باہر نکال کر لائے۔ ۱۸۷۹ء میں مدرسہ ''دار العلوم'' میں مدرّس کے طور پر تدریس کا آغاز کیا۔ ۱۸۸۲ء میں انگریزوں کی حکومت کے خلاف احمد عرابی پاشا کے انقلاب میں اپنے استاذ جمال الدین افغانی کے ساتھ شریک رہے۔ اس

تحریک کی ناکامی پر جیل بھیجے گئے اور بعد ازاں ان کو زبردستی بیروت بھیج دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں اپنے استاذ کی دعوت پر پیرس تشریف لے گئے اور "العروۃ الوثقی" نام سے ایک عربی رسالہ جاری کیا۔ ۱۸۸۵ء میں پھر بیروت آ گئے اور "العروۃ الوثقی" کے نام سے ہی ایک خفیہ تحریک کی بنیاد رکھی۔

۱۸۸۹ء میں حکومت کے ساتھ اس معاہدے پر اتفاق کرتے ہوئے کہ آئندہ وہ کسی قسم کا سیاسی کام نہیں کریں گے، مصر واپس آ گئے اور انہیں ابتدائی عدلیہ میں جج مقرر کر دیا گیا۔ بعد ازاں انہیں مجلس قانون ساز کا رکن بھی مقرر کیا گیا۔ ۱۸۹۹ء میں ان کو مصر کی حکومت کی طرف سے سرکاری طور پر مفتی عام کا درجہ دے دیا گیا اور وہ مصر کے پہلے مفتی عام تھے۔ ۱۹۰۰ء میں مخطوطات (manuscripts) کی نشر و اشاعت کے لیے "جمعية إحياء العلوم العربية" کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۰۵ء بمطابق ۱۳۲۳ھ میں اسکندریہ کے علاقہ میں کینسر کے مرض کی وجہ سے وفات پائی۔ ان کے شاگردوں میں رشید رضا، حافظ ابراہیم، شیخ عزالدین قسام، شیخ ازہر محمد مصطفی مراغی، شیخ ازہر مصطفی عبد الرزاق، شیخ محمد محی الدین عبد الحمید، سعد زغلول، قاسم امین، محمد لطفی جمعہ اور طہٰ حسین رحمہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی زندگی میں نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو عربی زبان اور علوم اسلامیہ کا احیا کریں اور مصری حکومت اور حکمرانوں کی بذریعہ تعلیم اصلاح کریں۔ ان کا اپنے استاذ سید جمال الدین افغانی سے یہ اختلاف تھا کہ وہ انقلاب کے لیے سیاست کی بجائے تعلیم کو بنیاد بناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں شیخ ازہر بنایا گیا تو وہ جامعہ ازہر کے نصاب اور مناہج تعلیم، طریقہ تدریس، اندازِ فکر اور نظم و ضبط میں انقلابی تبدیلیاں لے کر آئے۔ انہوں نے تقلیدی جمود کے برعکس جمیع فقہی مذاہب اسلامیہ سے برابری کی سطح پر استفادہ کی دعوت پر زور دیا۔ ان کے بعد آنے والے شیوخ الازہر کی ایک بڑی تعداد نے اپنے فتاویٰ میں ان کے اس منہج کو برقرار رکھا، بلکہ شیخ مصطفی المراغی رحمہ اللہ کے زمانے میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی علماء کی ایک گیارہ رکنی

کمیٹی بنادی گئی تھی جو مختلف مسائل میں اتفاقی فتویٰ جاری کرتی تھی۔ مفتی محمد عبدہٗ کے بعد بہت سے شیوخ الازہر حنفی ہونے کے باوجود کئی ایک مسائل میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے موقف پر فتویٰ جاری کرتے تھے۔

کتب کا تعارف:

- "واردات" ان کی پہلی کتاب ہے جو ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب انہوں نے صوفیاء کے منہج پر علمِ کلام اور توحید کے بیان میں لکھی ہے۔ چارلس ایڈیمس کے بقول ان کی اس کتاب سے ان کے ذہن پر وجودیت کا تسلط واضح نظر آتا ہے۔
- وحدت الوجود کے بارے بھی ان کا ایک رسالہ موجود ہے۔
- اسماعیل پاشا کی تاریخ پر بھی ایک کتاب لکھی۔
- "نہج البلاغہ" کی ایک شرح لکھی۔
- بدیع الزمان ہمذانی کے "مقامات" کی شرح لکھی۔
- منطق میں "شرح البصائر النصیریة" کے نام سے کتاب لکھی۔
- "مصر میں تعلیم و تربیت کا نظام" کے عنوان سے بھی کتاب لکھی۔
- اتحاد بین المذاہب پر ایک رسالہ "رسالة التوحید" کے نام سے لکھا اور یہ ان کی معروف ترین کتابوں میں سے ہے۔ بعض عیسائیوں نے اس کتاب کے چند مباحث حذف کرنے کے بعد اس کو اپنے اداروں میں بطور نصاب بھی مقرر کیا ہوا ہے۔
- جامعہ ازہر میں محرم ۱۳۱۷ھ میں تفسیر کی تدریس کا آغاز کیا جو ۱۳۲۳ھ تک جاری رہا۔ اس دوران انہوں نے سورۃ النساء کی آیت ۱۲۵ تک تفسیر مکمل کی جو تفسیر "المنار" کے نام سے پہلی پانچ جلدوں میں موجود ہے اور طبع شدہ ہے۔ تفسیر "المنار" مفتی محمد عبدہٗ کے شاگرد رشید رضا نے مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ شیخ رشید رضا کی تفسیر سورۃ النساء کی آیت ۱۲۶ سے لے کر

سورۂ یوسف تک "المنار" کے نام سے مطبوع ہے۔

افکار و نظریات:

مفتی محمد عبدہٗ تقلید کے مخالف، آزادئ فکر اور سلف صالحین کے منہج پر بذاتِ خود دین کو سمجھنے کے قائل تھے۔ عقل و نقل میں تعارض ہو جائے تو عقل کی ترجیح کے قائل تھے اور اس ترجیح کو علمائے اہل سنت کے ہاں اتفاقی مسئلہ قرار دیتے تھے۔ اپنے استاد سید جمال الدین افغانی کے ساتھ عالمی ماسونی تحریک کی مجالس میں بھی شریک ہوتے تھے، لیکن اس شرکت کے مقاصد کیا تھے یہ واضح نہ ہو سکے۔ وطنیت کے فلسفہ کے شدت سے قائل تھے اور اسی بنا پر انہوں نے مصر میں مسلمانوں اور قبطیوں کے مابین اختلاف میں قبطیوں کے حق میں لکھا۔

ڈاکٹر محمد عمارہ اور دیگر محققین کے نزدیک مفتی محمد عبدہٗ کے شاگرد قاسم امین مصری کی کتاب "تحریر المرأة المُسلمة" کا اکثر حصہ مفتی محمد عبدہٗ کا ہے جبکہ اس کا کچھ حصہ قاسم امین نے لکھا تھا۔ بعد میں اس کتاب پر مفتی محمد عبدہٗ نے نظر ثانی کی تاکہ مکمل کتاب کا منہج اور اسلوب یکساں ہو جائے۔ اس کتاب میں انہوں نے کہا ہے کہ عورت کے لیے اپنے چہرے کو چھپانا شرعاً یا آداباً واجب نہیں ہے بلکہ یہ اہل عرب کا رواج تھا جو آج تک چلا آرہا ہے اور اُمت اس رواج پر کبھی بھی متفق نہ ہو سکی۔ ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے علاوہ جسم کے ڈھانپنے کو وہ شرعی حکم میں داخل سمجھتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے تعددِ ازواج کو بھی اللہ کے رسول ﷺ کے دور کی ایک ضرورت قرار دیا ہے اور عصر حاضر میں اس کی ممانعت کے قائل تھے۔ اس کتاب میں ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ستر و حجاب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عورتوں اور مردوں کا اختلاط جائز ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے جس اختلاط سے منع کیا ہے، وہ ایک مرد اور عورت کا تنہا ہونا ہے۔ طلاق کے اکثر مسائل میں انہوں نے فقہ حنفی یا جمہور فقہاء کے خلاف امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ظاہریہ کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔

ڈاکٹر محمد عمارہ نے "الأعمال الكاملة لمحمد عبده" میں لکھا ہے کہ مفتی محمد عبدہ

کے نزدیک عقیدہ میں خبر واحد حجت نہیں ہے۔ اسی طرح ''منهج المدرسة العقلية الحديثية للرومی'' میں ہے کہ مفتی محمد عبدہٗ وحدتِ ادیان کے فلسفہ کے قائل تھے۔ شیخ یوسف نبہانی نے مفتی محمد عبدہٗ پر ایک نظم لکھی ہے جس میں انہوں نے انہیں شیخ فاسق قرار دیا ہے اور ان پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ بعض اوقات نماز ترک کر دیتے تھے اور انہوں نے باوجود استطاعت کے حج بھی نہ کیا جبکہ وہ بڑے بڑے حکومتی عہدوں مثلاً مفتی مصر، شیخ الازہر، رکن مجلس قانون ساز وغیرہ پر فائز رہے تھے۔ دجال کے ظہور سے مراد شخص دجال نہیں لیتے تھے بلکہ اس سے مراد فتنہ دجالیت لیتے تھے۔ سورۃ الفیل کی تفسیر میں ''طيرًا أبابيل'' سے پرندوں کی بجائے مچھر اور مکھیاں مراد لی ہے اور کہا ہے کہ ان کے پتھر مارنے سے مراد ان کا کاٹنا ہے جس سے جراثیم مخالفین کے جسم میں گھس کر انہیں ہلاک کر دیتے تھے۔

تفسیر قرآن میں تاویلات:

اب ہم مفتی محمد عبدہٗ کی تفسیر کے چند مقامات قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہیں گے جس میں انہوں نے تکلف کے ساتھ قرآن کی تفسیر عقلی منہج پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۵۰ ﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ﴾ کی تفسیر میں مفتی محمد عبدہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے ذریعے سمندر کے پھٹ جانے کے معجزہ کا اقرار کیا ہے اور معجزات پر ایمان کو من جملہ ایمانیات میں شامل قرار دیا ہے۔ انہوں نے ان لوگوں کی تاویلات کا رد بھی کیا ہے جو اس معجزے کی عقلی توجیہہ سمندر کے مدّ و جزر سے کرتے ہیں، جیسا کہ سرسید کا موقف ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۳ ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ کے ذیل میں طور پہاڑ کے حسی طور پر بنی اسرائیل پر اٹھائے جانے کا انکار کیا ہے اور اس سے پہاڑ کا زلزلہ اور اس کے سایہ کا ان پر چھا جانا مراد لیا ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۳ ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ میں احیائے موتیٰ کے معجزہ کی تاویل کی ہے۔ گائے کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کو مارنے کی انہوں نے یہ تاویل کی ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ

رواج تھا کہ جس بستی میں کوئی شخص قتل کیا جاتا اور قاتل کا علم نہ ہوتا تو جو شخص اس رسم کے مطابق عمل کر لیتا تھا تو وہ مقتول کے خون سے بری ہو جاتا تھا اور جو اس رسم کے مطابق عمل نہ کرتا تھا اس پر قتل کا الزام عائد ہو جاتا تھا۔ اس آیت میں مردوں کو زندہ کرنے کی انہوں نے یہ توجیہہ کی ہے کہ اس سے مراد قانونِ قصاص ہے کیونکہ قصاص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس میں تمہارے لیے زندگی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۱ ﴿بَلَى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ کی تفسیر میں انہوں نے گناہ کبیرہ پر استمرار اور عدم توبہ کو ایمان کے منافی قرار دیا ہے اور ایسے گناہ کبیرہ کے مرتکبین کلمہ گو مسلمانوں کو دائمی جہنمی قرار دیا ہے اور اس مسئلے میں معتزلہ کا نام لے کر ان کے مسلک کو قرآن کی نص کے قریب قرار دیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر مسلمان گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے اور اس پر اسے شرمندگی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ توبہ کرتا ہے بلکہ اس گناہ کا ارتکاب جاری رکھتا ہے تو ایسا کلمہ گو مسلمان کافر ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۷ ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ میں روح القدس سے مراد وحی لی ہے جبکہ مفسرین اس سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام لیتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ سے بھی وحی ہی مراد لی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۲ ﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ﴾ کے بارے میں کہا ہے کہ اس میں ﴿مَلَكَيْنِ﴾ سے مراد دو عام انسان ہی تھے لیکن ان کو فرشتہ اس لیے کہا گیا ہے کہ لوگ ان کو فرشتہ سمجھتے تھے یا مجازاً فرشتہ کہہ دیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۴۳ ﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ﴾ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں موت سے مراد دشمن کے سامنے مغلوب و مقہور ہونا ہے اور دوبارہ زندہ کرنے سے مراد دوبارہ آزادی اور قوت دینا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۳۷ ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ میں اس

واقعے کے خرقِ عادت میں سے ہونے کا انکار کیا ہے اور یہ الزام عائد کیا ہے کہ متقدمین نے قرآن میں اکثر و بیشتر مقامات پر تفسیر کرتے ہوئے خرقِ عادت واقعات کا اثبات من گھڑت اسرائیلیات سے کیا ہے جو تفسیر کا درست منہج نہیں ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ ﴿وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مردوں کو زندہ کرنے کے معجزات کے بارے میں کہا ہے کہ اس میں توقف کرنا چاہیے اور قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۵۵ ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ کے ذیل میں نزولِ مسیح کا انکار کیا ہے اور احادیث میں نزولِ مسیحؑ سے ان کی حقیقی تعلیمات کا دنیا میں غلبہ مراد لیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیات ۱۱۳ تا ۱۱۵ کے ذیل میں یہ بیان کیا ہے کہ اہل کتاب اگر اپنے بچے کھچے دین پر صحیح معنوں میں عمل کرتے ہیں، چاہے وہ اسلام نہ بھی قبول کریں، تو اللہ کے ہاں متقین اور صالحین میں شمار ہوں گے۔

خلاصۂ کلام:

مفتی محمد عبدہٗ کی نیت اور خلوص پر تو کوئی شک نہیں ہو سکتا لیکن ان کی تفسیر اور افکار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پر عقلیت (rationalism) اور اعتزال کا حد درجے غلبہ ہے۔ مفتی محمد عبدہ کی مثال ہم برصغیر میں اعتزالِ جدید کی تحریک کے رہنما جناب سرسید احمد خان سے دے سکتے ہیں، جنہوں نے اپنے اخلاص کے باوصف دین اسلام اور قرآن و سنت کی نصوص و تعلیمات کا حلیہ بگاڑ دیا۔ سرسید اور مفتی محمد عبدہٗ کے تقابلی مطالعے سے یہ فرق ان دونوں حضرات میں بہت نمایاں نظر آتا ہے کہ مفتی محمد عبدہٗ کو علوم دینیہ میں جو رسوخ حاصل تھا وہ سرسید کے حصے میں نہیں آیا تھا، لہٰذا یہی وجہ ہے کہ قرآن کے بعض مقامات پر جہاں سرسید بھٹک گئے وہاں مفتی محمد عبدہٗ ہمیں اہل سنت اور سلف صالحین کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے سمندر کے پھٹ جانے کے معجزہ کے اقرار یا انکار کا معاملہ ہے۔ عقل پرستی کی بنیاد پر فکری بگاڑ اور انحراف دونوں حضرات میں موجود ہے لیکن سرسید تو اس مسئلے میں

کسی ضابطے کے پابند نہیں ہیں جبکہ مفتی محمد عبدہ بعض مقامات پر عقل کے بالمقابل نقل کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کی من گھڑت تاویلات میں نہیں پڑتے۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ مفتی محمد عبدہٗ کے ہاں گمراہی اس درجے کی نہیں جو سرسید کے ہاں پائی جاتی ہے۔
جہاں تک ان کے حج نہ کرنے کا معاملہ ہے تو یہ ایک بہت بڑی کوتاہی ہے۔ بعض حضرات نے ان کے نماز نہ پڑھنے کو نقل کیا ہے اور اس نقل کا انداز بھی کچھ یوں ہے کہ کوئی صاحب ان کے ساتھ کسی مجلس میں موجود تھے تو نماز کا وقت آنے پر انہوں نے نماز نہ پڑھی یہاں تک کہ اگلی نماز کا وقت ہو گیا اور اس واقعے کو ان صاحب نے آگے نقل کر دیا۔ اس قسم کے واقعات میں ہمارے خیال میں یہ توجیہہ کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے دو نمازیں جمع کر لی ہوں گی۔ جس شخص کے افکار میں اس قدر آزادی اور حریت فکر موجود ہو تو اس سے یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ وہ بلا عذرِ شرعی بھی دو نمازیں جمع کرنے کا قائل ہو۔ واللہ اعلم بالصواب!

محمد رشید رضا

ان کا نام محمد رشید بن علی رضا بن محمد شمس الدین بن سید بہاء الدین ہے۔ اپنے والد اور والدہ کی طرف سے اپنے نسب کی نسبت آل بیت کی طرف کرتے تھے۔ ان کی ولادت ۲۷ جمادی الاولی ۱۲۸۲ھ بمطابق ۱۸۶۵ء شام کے علاقہ طرابلس کے جنوب میں سمندر کے کنارے آباد ایک بستی ''قلمون'' میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم طرابلس کے مدرسہ رشیدیہ میں حاصل کی، یہاں تعلیم ترکی زبان میں دی جاتی تھی کیونکہ یہ مدرسہ سلطنت عثمانیہ کے تابع تھا۔ بعد ازاں طرابلس میں ہی مدرسہ وطنیہ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے جس کے پرنسپل شیخ حسین الجسر تھے اور یہاں عربی، ترکی اور فرانسیسی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد یہ مدرسہ بوجوہ بند ہو گیا تو رشید رضا نے دوسرے مدارس کا رخ کیا اور شیخ حسین سے بھی ممکن حد تک استفادہ کرتے رہے۔ محمد رشید رضا کی زندگی پر دو اشخاص کے اثرات اور افکار کا غلبہ رہا، ان میں سے ایک تو شیخ حسین تھے اور دوسرے مفتی محمد عبدہٗ۔

انہوں نے امام غزالی کی کتاب "احیاء العلوم" کا مطالعہ کیا تو تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ عبادات اور مجاہدات میں اس قدر مشغول ہوئے کہ بعض اوقات انہیں یوں محسوس ہوا کہ ان کا جسم موجود ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے بعض روحانی تجربات بھی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے شروع میں شاذلی اور بعد میں نقشبندیہ سلسلہ میں سلوک کی منازل طے کیں یہاں تک کہ وہ صاحب کرامات بن گئے۔ ڈاکٹر ابراہیم احمد العدوی نے اپنی کتاب "رشید رضا الإمام المجاهد" میں ان کی کئی ایک کرامات کا تذکرہ کیا ہے۔ آخر عمر میں وہ تصوف میں ذکر واذکار کے مروّج طور طریقوں اور کشف وغیرہ کو بدعت قرار دیتے تھے اور سلفیت کی طرف مائل ہو گئے تھے اور اپنے شیخ اور مربی حسین الجسر پر اپنے رسالے میں رد بھی شائع کیا۔

رشید رضا ایک پُرجوش داعی اور مبلغ بھی تھے۔ مساجد میں دروس کا اہتمام کرتے تھے اور قہوہ خانوں میں جا کر لوگوں کو تبلیغ کرتے تھے۔ اسی طرح گاؤں کی عورتوں کی دینی تعلیم کے لیے بھی فقہی مسائل کے حلقے قائم کرتے تھے۔ قبر پرستی کے خلاف تھے اور قبروں سے تبرک لینے سے شدت سے منع کرتے تھے۔ اسی طرح ان درختوں کو کاٹنے کا حکم دیتے تھے جن سے عامۃ الناس تبرک حاصل کرتے تھے۔

اسی دوران سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کے رسالے "العُروۃ الوُثقیٰ" کے کچھ شمارے ان کے ہاتھ لگے جن سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ بقیہ زندگی انہی کی صحبت میں گزار دی۔ ۱۳۱۴ھ میں سید جمال الدین افغانی کی وفات کے بعد ان کے علمی وارث مفتی محمد عبدہٗ سے استفادہ کے لیے مصر منتقل ہو گئے۔ ۱۳۱۵ھ میں رشید رضا کی مصر آمد ہوئی اور انہوں نے اپنے استاذ مفتی محمد عبدہٗ سے قرآن کی تفسیر کا مطالبہ کیا تو ان کی اس خواہش پر محرم ۱۳۱۷ھ میں مفتی محمد عبدہٗ نے قرآن کی تفسیر کی ابتدا کی، جس کا بیان محرم ۱۳۲۳ھ تک جاری رہا اور اس دوران انہوں نے سورۃ النساء کی آیت ۱۲۵ تک تفسیر مکمل کی۔ استاذ کی وفات کے بعد رشید رضا نے اس تفسیر کو مکمل کرنے کی کوشش کی اور انہوں نے یہ تفسیر سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۱ تک مکمل کی۔ رشید رضا نے لکھا ہے کہ انہوں نے

اس تفسیر کی تکمیل اپنے استاذ کے منہج سے ہٹ کر کی ہے اور آیات کی تفسیر میں مروی صحیح روایات کو کثرت سے بیان کیا ہے، علماء کے اختلافات کا بھی تذکرہ کیا ہے اور مفرداتِ قرآن کی بھی لغوی تحقیقات پیش کی ہیں۔ سورۂ یوسف کے بعد اس تفسیر کی تکمیل استاذ بہجت بیطار نے کی ہے۔ انہوں نے "المنار" کے نام سے شوال ۱۳۱۵ھ بمطابق ۱۸۹۸ء ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ اس کا آخری شمارہ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ بمطابق ۱۹۳۵ء شائع ہوا۔ ان کا یہ رسالہ عالم عربی کے علاوہ عالم اسلام اور یورپ کے علمی حلقوں میں بھی بہت معروف ہوا۔ اس رسالہ میں وہ اپنے اور اپنے استاذ مفتی محمد عبدہ کے افکار شائع کرتے تھے۔ اس رسالہ کو انہوں نے بدعات کے خاتمے اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بھی بنایا۔ ۱۳۳۰ھ میں "معهد الدعوة والإرشاد" کے نام سے ایک ادارہ بنایا جس میں تین سالہ تربیتی کورس کے بعد طلبہ کو "مرشد" کا سرٹیفکیٹ دیا جاتا تھا اور انہیں مسلمانوں کی تربیت کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ اگر کوئی طالب علم تین سال مزید تربیت لیتا تو اسے غیر مسلموں میں بھی دعوت کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ اپنے وقت میں اس مدرسے نے بڑے بڑے داعی پیدا کیے۔ اپنے استاذ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جامعہ ازہر کی اصلاح کے لیے بھی لکھتے رہے۔ اپنے استاذ کی زندگی میں رشید رضا نے سیاست میں کچھ لکھا یا لکھنے کا ارادہ کیا تو مفتی محمد عبدہٗ نے اس کی شدت سے مخالفت کی، کیونکہ وہ سیاست کے ذریعے اصلاح کے نقطہ نظر کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، البتہ استاذ کی وفات کے بعد رشید رضا سیاست کے میدان میں کھل کر سامنے آ گئے اور سلطنت عثمانیہ پر کڑی نقد کی۔ ۱۳ جمادی الاُولی ۱۳۵۴ھ بمطابق ۱۹۳۵ء ان کی وفات ہوئی اور اپنے استاذ مفتی محمد عبدہٗ کے ساتھ دفن کیے گئے۔

کتب کا تعارف:

شیخ رشید رضا نے اپنی زندگی میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی معروف کتابوں میں "الحكمة الشرعية في محاكمة القادرية والرفاعية" نامی کتاب ہے اور یہ ان کی اولین تصنیف ہے۔ اسی طرح مجلہ "المنار" ہے کہ جس کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔ علاوہ

ازیں کتب میں تاریخ الأستاذ الإمام محمد عبده، الوحی المحمدی، المنار والأزہر، ذکر المولد النبوی، یسر الإسلام، الخلافۃ، الوہابیون والحجاز، السنۃ والشیعۃ، مناسک الحج، تفسیر المنار، الربا والمعاملات فی الإسلام، مساواۃ الرجل بالمرأۃ، رسالۃ فی أبی حامد الغزالی، المقصورۃ الرشیدیۃ، شبہات النصاریٰ وحجج الإسلام، خلاصۃ السیرۃ المحمدیۃ، انجیل برنابا، المسلمون والقبط، عقیدۃ الصلب والفداء، محاورات المصلح والمقلد، فتاوی السید رشید رضا وغیرہ شامل ہیں۔

افکار و نظریات:

شیخ رشید رضا نے اپنے رسالے کی اشاعت کے لیے اپنا مطبع بھی قائم کیا تھا۔ بعد ازاں اس مطبع سے انہوں نے سلف صالحین کی کتابیں شائع کرنی شروع کیں۔ امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم اور شیخ محمد بن عبد الوہاب ﷭ کی کتب کو انہوں نے خاص طور پر شائع کیا جس کی وجہ سے ان کے مخالفین نے انہیں وہابی کہنا شروع کر دیا۔ رشید رضا، شیخ محمد بن عبد الوہاب کے سلفی عقیدے کا حد درجے دفاع اور تبلیغ کرتے تھے۔ اپنی کتاب "السُّنّۃ والشیعۃ" میں انہوں نے شیخ محمد بن عبد الوہاب کی تحریک پر اہل تشیع کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اپنی کتاب "الوہابیون والحجاز" میں انہوں نے کئی ایک مقالات کی صورت میں شیخ محمد بن عبد الوہاب کے مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ مفتی محمد عبدہٗ کے بعض دوسرے شاگردوں مثلاً استاذ محمد حسین ہیکل، شیخ عبد العزیز جاویش اور استاذ محمد فرید وجدی نے ان کے خلاف یہ محاذ کھول دیا کہ یہ اپنے شیخ مفتی محمد عبدہٗ کے منہج سے منحرف ہو گئے ہیں اور ان کے خلاف کئی ایک رسالے جاری کیے۔ انہوں نے اپنے اساتذہ کی طرح تحریک ماسونیت میں شرکت اختیار نہیں کی بلکہ اس کی رکنیت سے منع کرتے تھے۔ خلافت عثمانیہ کے ادارے کے خاتمے کے بعد انہوں نے خلافت کی بحالی کے لیے "الخلافۃ أو الإمامۃ العظمیٰ" کے نام سے کتاب لکھی اور خلافت ختم کرنے کی وجہ سے مصطفی کمال پاشا کو ملحد قرار دیا۔

شیخ محمد رشید رضا کے صوفیت سے سلفیت کی جانب اس ذہنی ارتقاء اور سفر کے باوجود بعض سلفی علماء کا یہ کہنا ہے کہ ان میں سید جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کی فکر کے کچھ اثرات ان کی وفات تک باقی رہے۔ان کا بھی اپنے استاذ مفتی محمد عبدہٗ کی طرح یہی موقف تھا کہ اگر قطعی عقلی دلیل اور نقلی دلیل (یعنی قرآن وسنت) میں تعارض ہو جائے تو عقل کو ترجیح ہو گی اور نقل کی کوئی ایسی تاویل کریں گے کہ وہ عقل کے مطابق ہو جائے۔ سورۃ الانفال کی آیت ۹ ﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے موقع پر فرشتوں کے نزول سے مراد اس کا ظاہری معنی نہیں ہے کہ باقاعدہ کوئی فرشتے آسمان سے نازل ہوئے تھے اور انہوں نے کوئی جنگ بھی لڑی تھی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں اطمینان اور سکون پیدا کر دیا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۵ ﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کی اس جماعت کو واقعتاً بندر بنا دیا گیا تھا بلکہ اس سے مراد انہیں بندروں کے ساتھ تشبیہ دینا ہے۔

امام مہدی کی روایات کو ضعیف اور موضوع قرار دیتے ہوئے ان کی شخصیت یا آمد کا انکار کیا ہے۔اسی طرح قیامت کی نشانیوں میں سے مغرب سے سورج کے طلوع ہونے پر عقلی اعتراضات وارد کیے ہیں اور اس بارے میں صحیح بخاری میں وارد روایت میں تشکیک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشقاقِ قمر کے معجزۂ نبویہ کا انکار کیا ہے، کیونکہ ان کے بقول یہ واقعہ خلاف عقل ہے اور اخبار آحاد سے مروی ہے لہٰذا ناقابل قبول ہے۔جنات کے بارے ان کا کہنا ہے کہ ان کے وجود سے انکار تو ممکن نہیں ہے لیکن ان سے مراد وہ بیکٹیریا یا جراثیم ہو سکتے ہیں جو انسانی خون میں دوڑتے پھرتے ہیں اور نظر نہیں آتے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۵ ﴿وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس حکم کے جاری ہونے کے بعد بھی جو شخص سود کھائے گا تو وہ دائمی جہنمی ہے۔ یعنی آیت کو معتزلہ کے مذہب کے مطابق اس کے

ظاہری مفہوم پر باقی رکھا ہے۔ مجلہ "المنار" کی جلد ۲۸ کے جزء ۱۰ میں جسم و روح کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفعِ سماوی اور نزولِ مسیح کے عقیدہ کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ در حقیقت عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔

خلاصہ کلام:

شیخ رشید رضا کے ہاں وقت کے ساتھ ساتھ افکار میں بہتری آئی ہے اور بہت سی باتوں میں انہوں نے اپنے استاذ کے منہج کی مخالفت کی ہے۔ اگرچہ ان کے بھی بہت سے افکار ایسے ہیں جو قابل تنقید ہیں اور ان کی تحریروں، بالخصوص تفسیر "المنار" اور مجلہ "المنار" کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی قرآن کی تفسیر میں بہت حد تک عقلیت کی طرف مائل تھے۔ پس ان کا جو کام شرک و بدعت کے رد میں ہے، وہ قابل تعریف ہے اور انہوں نے جو تحقیقات قرآن کی عقلی تشریح و تعبیر میں پیش کی ہیں، وہ قابل مذمت ہے۔

طٰہٰ حسین

۱۸۸۹ء میں مصر کے علاقہ "منیا" میں پیدا ہوئے۔ عربی زبان و ادب کی نمایاں شخصیات میں شمار ہوتے ہیں اور "عميد الأدب العربي" کے لقب سے معروف ہوئے۔ ذاتی زندگی (biography) پر لکھنے کا آغاز ان سے ہوا اور ان کی اس بارے میں معروف کتاب "الأیام" ہے جس میں انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کو بیان کیا ہے۔ طہ حسین تیرہ بہن بھائی تھے جن میں ان کا نمبر ساتواں تھا۔ تین سال کی عمر میں ان کی نظر ضائع ہو گئی۔ بچپن میں ہی قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد جامعہ ازہر سے وابستہ ہو گئے اور وہاں سے مذہب اور عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں قاہرہ یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے اور وہاں قدیم مصری تہذیب، اسلامی تہذیب، جغرافیہ، فلکیات، فلسفہ اور ادب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۴ء میں اسی یونیورسٹی سے معروف عربی شاعر "ابو العلاء المعری" پر اپنی پہلی پی۔ ایچ۔ ڈی مکمل کی۔ اس کے بعد انہوں نے فرانس کی معروف یونیورسٹی "ساربونے" سے معروف مؤرخ ابن خلدون کے موضوع پر ۱۹۱۷ء

میں اپنی دوسری پی۔ایچ۔ڈی بھی مکمل کی اور ۱۹۱۸ء میں مصر واپس آ گئے۔ ۱۹۱۹ء میں قاہرہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں مصر میں وزارت تعلیم کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ ۲۸/اکتوبر ۱۹۷۳ء کو ان کی قاہرہ میں وفات ہوئی۔

افکار اور نظریات:

ڈاکٹر طٰہ حسین کا اکثر و بیشتر تحقیقی کام عربی ادب اور تاریخ پر ہے۔ ان کی معروف کتابوں میں الأیام، فی الشعر الجاهلی، اور الأدب الجاهلی ہیں۔ اس کے علاوہ کتب اور مقالات میں الفتنة الکبریٰ عثمان، الفتنة الکبریٰ علی وبنوه، علی هامش السیرة، حدیث الأربعاء، من حدیث الشعر والنثر، مستقبل الثقافة فی مصر، أدیب، شجرة السعادة، الوعد الحق، الشیخان، مع المتنبی اور ذکری أبی العلاء کے نام سے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں طٰہ حسین نے "فی الشعر الجاهلی" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ جاہلی شاعری یا جاہلی ادب اسلام کے ظہور کے بعد مرتب ہوا ہے اور اس کی نسبت ما قبل اسلام دور جاہلیت کی طرف کر دی گئی ہے۔ ان کے اس نقطہ نظر پر فلسفہ اور علم لغت کے ماہرین میں سے مصطفی صادق رافعی، خضر حسین، شیخ محمد خضری اور محمد لطفی جمعہ نے نقد کی۔

اسی طرح جامعہ ازہر کے بعض علماء نے بھی ان کی اس کتاب پر مذہبی پہلو سے نقد کی اور چار مقامات پر اعتراضات وارد کیے، جن کا تذکرہ "فی الشعر الجاهلی" کے نئے ایڈیشن کے آخر میں کیا گیا ہے:

- ان میں سے ایک اعتراض تو یہ تھا کہ طٰہ حسین نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے وجود اور ان کے بیت اللہ کی تعمیر والے واقعے کے ثبوت میں تاریخی روایات نہ ہونے کی وجہ سے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا جواب طٰہ حسین کے بعض شاگردوں کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ انہوں نے بعض دوسرے مقامات پر اس واقعے کے ثبوت سے متعلق اپنے یقین کا

اظہار بھی کیا ہے۔

- دوسرا اعتراض یہ تھا کہ طٰہٰ حسین نے سبعہ و عشرہ قراءات کو منزل من اللہ ماننے سے انکار کیا ہے، ان کے خیال میں ''سبعہ احرف'' سے مراد لغات کا اختلاف ہے۔ انہوں نے اپنی دوسری کتاب میں یہ واضح کیا ہے کہ وہ قراءات کے منکر نہیں ہیں اور اس کے ساتھ ہی ابن جریر طبری کا موقف تفصیل سے نقل کر دیا اور کہا کہ اس پر غور کریں، کیا یہ قراءات کا انکار ہے؟
- تیسرا اعتراض یہ وارد کیا گیا کہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں نبی اکرم ﷺ کے نسب نامے کی توہین کی ہے۔
- چوتھا اعتراض یہ وارد کیا گیا کہ انہوں نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ دین اسلام، دین ابراہیمی ہی کا ایک تسلسل ہے اور وہ یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ عرب کا اصل دین، دین ابراہیمی تھا۔

ہم ان اعتراضات کو بغور جانچنے کے بعد اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ ان چار مقامات میں طٰہٰ حسین کی عبارت میں تسامح موجود ہے، اگرچہ یہ ان کے کوئی پختہ عقائد معلوم نہیں ہوتے، کیونکہ یہ چاروں مقامات اس کتاب کے بنیادی موضوع سے متعلق نہیں ہیں بلکہ ذیلی بحث اور مناظرانہ اسلوب کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں۔ بہر حال مصری حکومت نے ان چار مقامات کو حذف کرنے کے بعد اس کتاب کی اشاعت کی اجازت دے دی ہے۔ جہاں تک طٰہٰ حسین کے ادب جاہلی یا اس کی تاریخ پر نقد کا معاملہ ہے تو ہمارے خیال میں یہ کوئی دین کا مسئلہ نہیں ہے کہ اس پر نقد نہ ہو سکے اور نہ ہی ادب جاہلی کو قرآن یا حدیث کی طرح کوئی تقدس حاصل ہے یا اس کی حفاظت کی ذمہ داری ربّ سبحانہ وتعالیٰ نے لی ہے۔ پس جس علمی اسلوب میں طٰہٰ حسین نے ادب جاہلی کو مشکوک قرار دیا ہے، اگر کسی کو اس بحث سے اتفاق نہیں ہے تو اسی علمی اسلوب میں اس کا جواب دینا چاہیے اور مصر کے معروف شعراء، ادباء اور ماہرین لغت نے طٰہٰ حسین کی اس تحقیق کا مسکت جواب دیا بھی ہے۔

اس کتاب کے بعد ڈاکٹر طہٰ حسین نے ''الأدب الجاھلی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اپنی اس کتاب میں انہوں نے مصر میں عربی زبان و ادب کے نصاب اور طریقہ تدریس پر کڑی نقد کی ہے۔ ان کے بقول فقہ کی طرح عربی ادب میں بھی تقلیدی جمود کی وجہ سے پہلی تین صدیوں کے بعد کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ طہٰ حسین کا خیال ہے کہ عربی ادب اور اس کی تاریخ کی تعلیم سے پہلے یہ ضرور جانچ لینا چاہیے کہ جو شے ہم عربی ادب کے نام پر پڑھانا چاہتے ہیں، وہ عربی ادب ہے بھی یا نہیں۔

انہوں نے عربی ادب اور تاریخ کی حقیقت جانچنے کے لیے مغربی طریقۂ تحقیق کو بہترین طریق کار قرار دیا ہے جس کے مطابق کسی چیز پر تحقیق کرنے سے پہلے اپنے ذہن کو اس سے خالی کر لیا جاتا ہے، یعنی اس کے وجود کو عدم سمجھتے ہوئے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے خیال میں معروف فلسفی ڈیکارٹ کا بھی یہی طریقہ تحقیق تھا۔ طہٰ حسین کا کہنا یہ ہے کہ ادب جاہلی کے نام سے جو ادب ہمارے ہاں پایا جاتا ہے یا پڑھایا جاتا ہے، وہ مشکوک ہے اور اس کی نسبت جاہلی شعراء کی طرف صحیح نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کے بقول اس جاہلی ادب کا اکثر حصہ گھڑا گیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر مجھے دورِ جاہلیت کی تہذیب اور کلچر معلوم کرنا ہو گا تو میں قرآن کی طرف رجوع کروں گا نہ کہ جاہلی شعراء امرؤ القیس، نابغہ، اعشیٰ، زہیر، قس بن ساعدہ اور اکثم بن ضیفی کے معلقات یا اشعار کی طرف، کیونکہ ان اشعار کی نسبت ان شعراء کی طرف ثابت نہیں ہے۔ طہٰ حسین کا کہنا یہ بھی ہے کہ ادب جاہلی میں جو شعراء مشہور ہیں، وہ اکثر و بیشتر یمنی قحطانی عرب ہیں یا پھر عدنانی ہیں اور ان دونوں قبیلوں کی زبان ان کے بقول عربی زبان نہیں ہے بلکہ یہ زبان عربی کی نسبت حبشی زبان کے زیادہ قریب ہے، لہٰذا ادب جاہلی یا ان قبیلوں کے شعراء کا کلام، عربی زبان کا ادب کیونکر قرار پا سکتا ہے؟ ان کا کہنا یہ ہے کہ عربی زبان کا اصل ادب قرآن مجید میں ہے۔ قرآن کا نزول لغت قریش میں ہوا اور قریش نے عرب کے بقیہ لہجات کو ختم کر دیا۔ پس اب اگر کسی نے ادب جاہلی کا مطالعہ کرنا ہو تو وہ قرآن کی نصوص کی روشنی میں اُس وقت کی جاہلی تہذیب اور کلچر کا

مطالعہ کرے۔ اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں مولوی محمد رضا انصاری صاحب نے کیا ہے جسے انجمن ترقی اردو دہلی نے شائع کیا ہے۔

اپنی کتاب "مستقبل الثقافة في مصر" میں انہوں نے کہا ہے کہ مصری تہذیب "بحر أبيض" کی تہذیب کا ایک حصہ ہے اور اس کا تعلق جزیرۂ عرب اور سوڈان کی نسبت لاطینی تہذیب سے زیادہ قریبی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے حاکم مصر خدیوی اسماعیل پر یہ زور دیا کہ مصر کو یورپ کا حصہ بنایا جائے۔ اسی کتاب میں انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ ہمیں اہل مغرب کی تہذیب کی تقلید کرنی چاہیے تاکہ ہم ان کے بالمقابل کھڑے ہو سکیں۔ انہوں نے اس کتاب میں مصر میں قومیت پرستی کی بنیادوں پر ایک ایسی حکومت تشکیل دینے کی ترغیب دی ہے جس میں دین کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ اس کتاب پر محمد کمال حسین، استاذ ساطع حصری، ڈاکٹر زکی مبارک، ڈاکٹر محمد بہی، ڈاکٹر محمد حسین اور سید قطب نے عمدہ نقد کیا ہے۔

طٰہٰ حسین کی کتاب "الشيخان" پر استاذ محمد عمر توفیق نے نقد کی ہے۔ علاوہ ازیں ان کی کتاب "على هامش السيرة" پر استاذ غازی التوبہ نے نقد کی ہے۔ ان کی کتاب "حديث الأربعاء" پر شیخ رفیق العظم نے نقد کی ہے۔ استاذ ابراہیم عبد القادر مازنی نے بھی اس کتاب پر نقد کی ہے۔ ان کی کتاب "مع المتنبي" پر شیخ محمود محمد شاکر نے نقد کی ہے۔ ان کی کتاب "ذكرى أبي العلاء" پر استاذ محمد سلیم جندی نے نقد کی ہے۔ اسی طرح طٰہٰ حسین کی کتاب "الفتنة الكبرىٰ" کے دونوں حصوں اور "من بعيد" پر استاذ غازی التوبہ نے نقد کی ہے۔

ڈاکٹر زکی مبارک نے طٰہٰ حسین پر اپنی نقد میں یہ الزام عائد کیا کہ ابن خلدون پر ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ مستشرق "کازانوفا" (Casanova) کے افکار کا سرقہ ہے۔ مستشرق "ماسینیون" (Massignon) کا کہنا ہے کہ جب میں نے طٰہٰ حسین کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ایویلیو ایشن (evaluation) کے لیے پڑھا تو کہا: "هٰذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا" یعنی یہ ہمارا ہی فکر ہے جو ہمیں لوٹا دیا گیا ہے اور جب میں ڈاکٹر

زکی مبارک کی ابحاث پڑھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک جدید فکر ہے۔[1] ڈاکٹر زکی مبارک نے طٰہٰ حسین پر یہ بھی الزام لگایا کہ یہ ایک خالی ڈھول کی مانند ہے اور اسے عربی ادب کی تاریخ کا کچھ پتا نہیں ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ سیاسی تعلقات کی بنا پر طٰہٰ حسین کو شہرت حاصل ہوئی ہے۔

ڈاکٹر محمد احمد عمراوی نے "جهل طه حسين بمنهج ديكارت" کے نام سے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں دعویٰ کیا ہے کہ طٰہٰ حسین ڈیکارٹ کے منہج تحقیق کی اتباع کے دعویدار ہیں حالانکہ انہیں اس کے منہج تحقیق کا پتا ہی نہ تھا۔ استاذ انور جندی نے "طه حسين في أحضان الاستشراق" کے نام سے ان پر نقد کی ہے۔ اس مقالے میں انہوں نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب "الشعر الجاهلي" کا مرکزی خیال مستشرق "مارگولیتھ" (Margoliouth) سے لیا ہے۔ اسی طرح "مع المتنبي" نامی کتاب میں طٰہٰ حسین نے جو نقطہ نظر پیش کیا ہے وہ مستشرق "بلاشیر" کا ہے۔ ابن خلدون پر اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں انہوں نے مستشرق "دورکایم" (Durkheim) سے استفادہ کیا ہے۔ تنقید کا طریق کار انہوں نے "رودنیر" (Rudner) سے لیا ہے۔ "حديث الأربعاء" نامی کتاب کا مرکزی خیال انہوں نے "سینٹ بیف" (Sainte-Beuve) سے اخذ کیا ہے۔ تاریخ ادب کے مصادر پر بحث میں طٰہٰ حسین نے "نلینو" (Nallino) سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح علم نحو کے ارتقاء میں ان کے افکار "برجستراشر" (Bergetrasser) اور علم لغت میں "جویدی" (Guidi) اور فقہ اللغہ میں "لیتمان" (Littmann) سے ماخوذ ہیں۔ قرآن کے بارے میں طٰہٰ حسین نے اپنے خیالات "کازانوفا" سے لیے ہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ انہیں جامعہ ازہر میں قرآن نہیں سمجھ آیا بلکہ انہوں نے فرانس میں عیسائی مستشرق "کازانوفا" سے قرآن سمجھا ہے۔ طٰہٰ حسین کا

[1] ڈاکٹر زکی مبارک، طٰہٰ حسین کے کلاس فیلو ہیں اور انہوں نے بھی مصر اور فرانس دونوں جگہ سے پی۔ایچ۔ڈی کی ہے۔

کہتا تھا کہ ان کی زندگی میں ''نلینو'' اور ''لیتمان'' کا بہت اثر ہے اور ''لیتمان'' تو انہیں اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔ استاذ عباس فضلی، محمود مہدی، ڈاکٹر فواد حسنین علی، استاذ احمد محمد جمال اور حسن البناء نے بھی طٰہٰ حسین پر نقد کی ہے۔

ان کی کتاب ''في الشعر الجاهلي'' پر محمد لطفی جمعہ، استاذ محمد خضر حسین، محمد فرید وجدی، محمد خضری اور ڈاکٹر محمد احمد عمراوی نے نقد کی ہے۔ ان سب حضرات کی طٰہٰ حسین پر تنقیدیں ''نقد كتاب الشعر الجاهلي'' کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ ان حضرات نے طٰہٰ حسین پر یہ نقد کی ہے کہ انہوں نے اپنے منہج تحقیق میں معروف فلسفی ڈیکارٹ کی اتباع کا دعویٰ کیا ہے حالانکہ انہوں نے اس مسئلے میں اس کی اتباع نہیں کی۔ ان حضرات کا کہنا یہ بھی ہے کہ طٰہٰ حسین ایک بات فرض کرتے ہیں اور اس کے اوپر پھر ایک اور مفروضہ قائم کرتے ہیں اور اس طرح مفروضہ در مفروضہ کے نتیجے میں ایک حتمی اور قطعی نتیجے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ پس طٰہٰ حسین ''فليس يبعد!''، یا ''فليس ما يمنع!''، یا ''فما الذي يمنع!''، کے الفاظ سے ایک بات کا آغاز کرتے ہیں اور ''أمر هذه القصة ذا واضح'' کے الفاظ میں حتمی فیصلہ سنا دیتے ہیں۔ مثلاً قرآن کی لغت میں شعر جاہلی سے استفادہ کرنے میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ بہت معروف ہے کہ ان سے ان کے ایک شاگرد نافع بن ازرق رحمہ اللہ نے قرآن کے تقریباً ۸۰ مقامات سے متعلق الفاظ کے معانی دریافت کیے تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان مقامات کے معانی بتلاتے ہوئے ادب جاہلی سے اشعار پڑھ کر سنائے۔ یہ واقعہ اکثر مفسرین نے نقل کیا ہے، تفصیل کے لیے امام سیوطی کی کتاب ''الاتقان'' کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین اس واقعے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''أليس من الممكن أن تكون قصة ابن عباس ونافع بن الأزرق قد وضعت في تكلف و تصنع؟'' کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور نافع بن ازرق رحمہ اللہ کا یہ قصہ تکلف اور تصنع سے گھڑ لیا گیا ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن ہے لیکن کسی شے کے امکان سے وہ چیز ثابت نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اگر ایک واقعہ میں جھوٹ کا

امکان ہے تو اس واقعے کی تحقیق، اس کے راویوں کی جانچ پڑتال اور قرائن کی چھان پھٹک ہو گی تو تب ہی اس واقعے کے بارے کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس کتاب میں جاہلی شعر کے من گھڑت ہونے پر جتنے اعتراضات وارد کیے ہیں، ان حضرات نے جاہلی شعر ہی کے بیان کے ذریعے ان تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جاہلی شعر میں دین اور اخلاق سے متعلقہ تصورات موجود نہیں ہیں۔ ان حضرات نے اس کے جواب میں جاہلی ادب کے وہ اشعار پیش کر دیے جن میں اعلیٰ اخلاقی اقدار یا دینداری کا تذکرہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کی تنقید نے طٰہٰ حسین کے نکتہ نظر کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ ان حضرات نے جا بجا یہ بھی واضح کیا ہے کہ جاہلی شعر سے متعلق ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا کون سا موقف کس مستشرق کی فکر سے ماخوذ ہے۔ امیر شکیب ارسلان نے بھی طٰہٰ حسین کی اس کتاب کا "الشعر الجاهلي والإسلام" کے نام سے رد کیا ہے۔ اس کے علاوہ استاذ مصطفی صادق رافعی نے "نقد الشعر الجاهلي" کے نام سے طٰہٰ حسین کا رد کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنے خلط مبحث کو علم کا نام دے دیا اور مستشرقین کی تقلید کو اجتہاد سمجھ لیا اور عربی ادب کے مجدد ہونے کے دعوے دار بن گئے۔ ڈاکٹر محمد بہی نے بھی "فكرة كتاب الشعر الجاهلي" کے نام سے اس کتاب کا رد کیا ہے۔

خلاصہ کلام:

ڈاکٹر طٰہٰ حسین پر عربی زبان و ادب، آزادئ فکر اور آزادانہ اسلوب تحقیق کے حوالے سے تجدد کا الزام لگایا جاتا ہے۔ جہاں تک عربی زبان و ادب میں تجدد کا معاملہ ہے تو ہمارے خیال میں یہ کوئی مستند اعتراض نہیں ہے کیونکہ یہ دینی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر اس مسئلے میں کسی کو ان کی تحقیق سے اتفاق نہیں ہے تو وہ اس کا علمی جواب دے۔ مصری ماہرین لغت، شعراء اور ادباء نے اس کا مسکت جواب دیا ہے اور یہی طرز عمل درست ہے۔ آزادئ فکر ان کے ہاں تھی۔ اگر تو یہ مذہب یا دین کی حدود کو پامال نہ کر رہی ہو تو

اس وقت تک اس پر بھی کوئی عیب نہیں لگایا جا سکتا، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ طٰہ حسین نے علوم شریعت سے ناواقفیت کے باوجود کئی دینی مسائل میں اپنی نام نہاد علمی آراء کا اظہار کیا ہے اور عربی زبان وادب میں رسوخ رکھنے والے مصری علماء نے ان کا تتبع بھی کیا ہے، جیسا کہ ہم سابقہ صفحات میں بعض علماء کے نام ذکر چکے ہیں۔

جہاں تک ان کے طریق تحقیق کا معاملہ ہے کہ جس میں انہوں نے معروف فلسفی ڈیکارٹ کی اتباع کی ہے، تو ہمیں اس اندازِ تحقیق سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ انداز تحقیق در حقیقت یونانیوں کا ہے جن سے معتزلہ نے لیا اور بنو عباس کے دور میں اس پر خوب بحثیں کیں۔ اس انداز تحقیق کے مطابق اگر آپ خدا کو ماننے والوں میں سے ہیں اور اس کا اثبات کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے ذہن کو خدا کے ہر قسم کے تصورات سے پاک کریں، یہاں تک کہ خدا کے وجود اور عدم وجود میں سے آپ کسی بھی عقیدہ کے حامل نہ ہوں اور اب تحقیق کریں۔ اور آپ کی تحقیق جہاں آپ کو پہنچا دے آپ اس کو مان لیں، اور یہ خدا کے وجود کا یقین بھی ہو سکتا ہے اور عدم وجود کا شک بھی۔ کچھ اشیاء کے ثبوت میں تو یہ اندازِ تحقیق درست معلوم ہوتا ہے لیکن اگر قطعی اور یقینی چیزوں کے ثبوت کے لیے بھی یہ طریقہ تحقیق استعمال کیا جانے لگے تو سوائے گمراہی کے اور کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک سوال ہے کہ انہوں نے واقعتاً ڈیکارٹ کے منہج تحقیق کی پیروی کی بھی ہے یا نہیں؟

توفیق الحکیم

توفیق الحکیم معروف ترین مصری ادیب ناول نگار اور ڈرامہ نویس ہیں۔ وہ ۹ اکتوبر ۱۸۹۸ء کو اسکندریہ کے علاقہ میں پیدا ہوئے اور ان کی وفات ۲۶ جولائی ۱۹۸۷ء میں ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء میں اپنی گریجویشن مکمل کی اور اس کے بعد اپنے والد کی خواہش پر قانون کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۲۵ء میں قانون کی تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے بطور وکیل پریکٹس شروع کر دی۔ ۱۹۲۵ء میں ہی ان کے والد نے اپنے سیاسی تعلقات کی بنیاد پر قانون میں

پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے پیرس میں ان کا داخلہ کروا دیا۔ ان کے پیرس جانے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ بعض معاصرین نے جب ان پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے ڈرامہ ”عودة الروح“ میں فرعونی مصری تہذیب کی طرف اپنے میلان کا اظہار کیا ہے تو ان کے والد نے ان کو مصر سے فرانس بھیج دیا تاکہ وہ ڈرامہ نویسی کو خیر باد کہہ دیں اور قانون کی تعلیم حاصل کریں۔ لیکن پیرس میں اپنے تین سالہ قیام کے دوران انہوں نے قانون کی تعلیم کی طرف توجہ دینے کی بجائے فرانسیسی سینما اور تھیٹر کے چکر لگانے شروع کیے۔ فرانسیسی، یورپین اور یونانی لٹریچر، لوک کہانیوں جنگوں اور ڈراموں کے علوم و فنون اور اصول و ضوابط کا قریب اور گہرائی سے مشاہدہ کیا۔ ۱۹۲۸ء میں توفیق الحکیم بغیر کسی ڈگری کے حصول کے مصر واپس آ گئے۔ ۱۹۲۹ء میں وزارتِ عدل و انصاف میں دوبارہ وکالت کے شعبہ سے منسلک ہو گئے لیکن اس پیشے میں ان کا دل نہ لگ سکا۔ ۱۹۳۴ء میں وزارت تعلیم میں تحقیقاتی کمیٹی کے صدر بن گئے۔ بعد ازاں انہوں نے ۱۹۳۷ء میں موسیقی اور ڈرامہ وغیرہ سے متعلقہ وزارت میں بطور ڈائریکٹر کام کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ”دار الكتب المصرية“ کے مدیر مقرر ہوئے اور ۱۹۵۴ء میں انہیں ”مجمع اللغة العربية“ کے لیے بطور رکن منتخب کیا گیا اور وہ تاحیات اس کے ممبر رہے۔ ۱۹۵۶ء میں ثقافت اور کلچر وغیرہ کی وزارت کے وکیل کے عہدے کے لیے سینٹ کے رکن کے طور پر ان کا انتخاب کیا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں پیرس میں یونیسکو تنظیم کے لیے مصری حکومت کی طرف سے مندوب مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں پھر مصر واپس آ گئے اور اپنے سابقہ عہدے پر دوبارہ کام شروع کر دیا۔ بعد ازاں معروف مصری اخبار ”الأهرام“ میں بطور مشیر کام کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء میں اس اخبار کی مجلس ادارت کے رکن بھی مقرر ہوئے۔

ان کی شہرت کا سبب اصحابِ کہف کے بارے میں ان کا لکھا ہوا ڈرامہ بنا جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ ان کے ڈراموں میں مصری تہذیب اور تاریخ کو نمایاں کیا گیا ہے چاہے وہ فرعونی و قبطی ہو یا عربی و اسلامی۔ توفیق الحکیم جدید عربی ادب کے ستونوں میں سے طٰہ

حسین، عباس عقاد، احمد امین، سلامہ موسیٰ، احمد شوقی اور حافظ ابراہیم وغیرہ کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے تقریباً ۹۰ سال کی عمر پائی۔

والدین: توفیق الحکیم پر نقد کرنے والوں نے ان کے والدین کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔ ناقدین کے بقول توفیق الحکیم کے والدین ان کی مناسب تربیت نہ کر سکے جس کی وجہ سے دینی اعتبار سے ان کی شخصیت میں بہت سی کمیاں اور کوتاہیاں رہ گئی تھیں۔ توفیق الحکیم نے اپنی کتاب "سجن العمر" میں لکھا ہے کہ ان کی والدہ کی ایک بہن تھی اور ان کی والدہ اور خالہ کے مابین ہمیشہ لڑائی ہوتی رہتی تھی، یہاں تک کہ انہوں نے ان دونوں بہنوں کے مابین کبھی بھی اتحاد و اتفاق نہ دیکھا۔ توفیق الحکیم نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی والدہ مزاج کی تیز اور اپنی ضد کی پکی تھیں۔ علاوہ ازیں ان کی والدہ انہیں ہمیشہ یہ جتلاتی رہتی تھیں کہ وہ ان کے والد سے زیادہ ذہین ہیں۔ توفیق الحکیم نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی والدہ نے جب پکی قسم کھانی ہوتی تھی تو معروف صوفی اور زاہد ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ کی قسم کھاتی تھیں اور اپنے بچوں کو بھی اسی کی تعلیم دیتی تھیں۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر میری والدہ حیاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم اٹھا لیتیں تو اس میں تو جھوٹ کا احتمال ہونے کا امکان ہوتا تھا لیکن جب وہ ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ کی قسم اٹھاتی تھیں تو ہر قسم کے جھوٹ کا احتمال رفع ہو جاتا تھا۔ یہ ساری باتیں توفیق الحکیم نے اپنی آپ بیتی "سجن العمر" میں بیان کی ہیں۔ اپنے احوال و ظروف پر توفیق الحکیم نے دو کتابیں تصنیف کی ہیں، ایک "سجن العمر" اور دوسری "زهرة العمر"۔

بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ توفیق الحکیم اپنی والدہ سے متاثر ہو کر عمر بھر اس قسم کے فاسد عقائد کے حامل رہے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب "عصفور من الشرق" کا انتساب لکھتے ہوئے "إلى حاميتي الطاهرة السيدة زينب" کے الفاظ استعمال کیے، یعنی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو انہوں نے حامیہ یعنی بچانے والی اور دوسرے الفاظ میں بیڑا پار لگانے والی قرار دیا ہے۔ توفیق الحکیم نے "سجن العمر" میں ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی والدہ کو اپنی اولاد کی نسبت اپنی ذات

اور خواہشات سے زیادہ محبت تھی۔

اپنے والد کی دینی حالت کے بارے میں توفیق الحکیم نے لکھا ہے کہ دین کے بارے میں ان کے خیالات میں تناقض اور تضاد تھا۔ وہ بظاہر نماز روزے کے پابند تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھ سے جنت و جہنم کے وجود اور عدم وجود پر فلسفیانہ گفتگو بھی فرما لیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے والد اپنی نوجوانی میں شراب نوشی بھی کرتے تھے بعد ازاں ان کی والدہ کو علم ہو جانے کے بعد انہوں نے اس قبیح عادت کو ترک کر دیا۔

توفیق الحکیم کی فکری نشوونما:

توفیق الحکیم کی فکری نشوونما میں درج ذیل چیزوں کا کردار نمایاں رہا ہے:

- سب سے پہلی شے جس نے توفیق الحکیم کی فکری بلوغت میں اہم کردار ادا کیا وہ لوک کہانیاں ہیں۔ ان کے بقول ان کی والدہ ان کو بچپن سے ہی ابوزید ہلالی اور الف لیلی کی کہانیاں بہت زیادہ سنایا کرتی تھیں۔ جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو انہوں نے عربی میں ترجمہ شدہ یورپین ادب کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ توفیق الحکیم کا کہنا ہے کہ انہیں بچپن میں اس قسم کی کہانیاں پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا، یہاں تک کہ والد کے منع کرنے کے باوجود وہ چار پائی کے نیچے گھس کر لالٹین کی روشنی میں کہانیاں پڑھا کرتے تھے۔
- دوسرے مرحلے میں ہائی سکول کی تعلیم کے دوران توفیق الحکیم کی توجہ عربی ادب کی طرف ہوئی اور انہوں نے معروف معتزلی عربی ادیب جاحظ اور دیگر شعراء اور ادباء کی کتب کا مطالعہ شروع کیا۔
- تیسرے مرحلے میں ان کا تعلق سینما اور ڈرامہ سے قائم ہوا۔ ہائی سکول کے زمانے ہی سے انہوں نے سینما کے چکر لگانے شروع کر دیے تھے اور اسی تعلق کی نسبت سے بعد ازاں وہ مصر کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار کے طور پر معروف ہوئے۔

قاہرہ میں قانون کی تعلیم کے دوران ان کا تعلق گلوکاروں اور تھیٹر شو والوں کے ساتھ

بھی قائم ہوا، جس نے ان کے اخلاق اور دین پر آئندہ کی زندگی میں برے اثرات چھوڑے۔ فرانس میں قانون کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے دوران ان کا تعلق یورپین اور فرانسیسی کلچر سے قائم ہوا اور انہوں نے یہاں معروف فلسفی سپنسر کی عربی میں ترجمہ شدہ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے ڈکشنری کی مدد سے براہ راست فرانسیسی زبان میں بھی فرانسیسی ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ ان کے بقول فرانسیسی ثقافت نے ان کے فکر کی اٹھان میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

دینی کتب کے مطالعہ نے بھی ان کے فکر پر گہرا اثر چھوڑا۔ ان کے بقول انہوں نے اپنی تحریروں میں قرآن، تورات اور انجیل وغیرہ سے کافی استفادہ کیا ہے۔ اپنے معروف ڈرامہ ''سلمان الحکیم'' کے بارے انہوں نے کہا کہ میں نے اس کی بنیاد قرآن، تورات اور الف لیلی پر رکھی ہے۔

شخصیت کی پیچیدگی:

توفیق الحکیم پر نقد کرنے والے اہل علم ان کی شخصیت کو ایک انتہائی گنجلک اور پیچیدہ شخصیت قرار دیتے ہیں، جیسا کہ توفیق الحکیم نے خود اپنے بارے میں یہ لکھا ہے: إنی أعیش فی الظاهر کما یعیش الناس فی هذه البلاد أما فی الباطن فما زالت آلهتی وعقائدی ومثلی العلیا کل آلامی مرجعها هذا التناقض بین حیاتی الظاهرة وحیاتی الباطنة یعنی میں ظاہری طور پر تو ایسے ہی زندگی گزار رہا ہوں جیسا کہ عام لوگ شہروں میں رہتے ہیں لیکن میرے باطن میں میرے کچھ معبود، عقائد اور بلند آئیڈیلز ہیں۔ میرا سارا درد سر میری ظاہری اور باطنی زندگی کا یہ تناقض ہے۔

اسی تناقض کی جھلک ان کی دینی زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے بقول وہ نوجوانی کے زمانے میں اپنے باپ کے ڈر سے صبح افطاری کر لیتے تھے لیکن بعد میں چپکے سے روزہ توڑ دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے سے متعلق عورتوں کے ساتھ چھیڑ خوانی، مشت زنی (masturbation)، زنا اور شراب نوشی کے بعض واقعات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''زهرة العمر'' میں لکھا ہے کہ وہ تین مہینے تک ایک جرمن

رقاصہ کے ساتھ ایک ہی کمرے میں ایک ہی چار پائی پر سوتے رہے۔ ناقدین نے لکھا ہے کہ گناہ گار تو ہر انسان ہوتا ہے لیکن توفیق الحکیم "مجاھر" تھے۔ مجاہر، حدیث کی اصطلاح ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہے جو گناہ کرے اور پھر اسے فخر سے بیان کرے اور اس پر کسی ندامت اور پشیمانی کا اظہار نہ کرے۔ مجاہرین کے لیے حدیث رسول میں وعید آئی ہے کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے گا۔

کتب اور ادبی کام:

توفیق الحکیم کا اصل اور زیادہ تر کام مصری ڈرامہ اور افسانہ پر ہے۔ انہیں مصر کا سب سے بڑا ڈرامہ اور افسانہ نویس شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے معروف ڈراموں میں أهل الكهف، شهر زاد، مشكلة الحكم، بجماليون، سليمان الحكيم، الملك أو ديب، الأيدى الناعمة، الصفقة اور لعبة الموت ہیں۔

ان کے معروف ناولوں میں عودة الروح، عصفور من الشرق، حمار الحكيم، الرباط المقدس اور أشعب ہیں۔ انہوں نے سیاست پر بھی بعض کتابیں لکھیں، جیسا کہ ان کی کتاب "عودة الوعی" اور "مصر بين عهدين" ہے۔ اپنی ذاتی زندگی پر انہوں نے "سجن العمر" اور "زهرة العمر" کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں۔

فکر اسلامی پر ان کی کتابوں میں التعادلية، التعادلية مع الإسلام، أرنى الله، تحت شمس الفكر اور الأحاديث الأربعة کے نام سے ہیں۔ ان کتب پر بعض علماء نے دینی اعتبار سے نقد کی ہے اور ان کے عقائد کو فاسد اور خلافِ اسلام قرار دیا ہے۔ انہوں نے "مختار تفسير القرطبي" کے نام سے تفسیر قرطبیؒ کی ایک تلخیص بھی کی ہے۔

افکار و آراء:

توفیق الحکیم پر ان کے بعض افکار کی وجہ سے تجدد پسندی اور مغرب کی تقلید کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ ایک اعتراض تو ان پر یہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے بعض ڈراموں مثلاً "أصحاب الكهف" اور "سليمان الحكيم" میں قرآن و حدیث میں بیان شدہ قصص اور تفصیلات کی بجائے بائبل کی عبارات کو بنیاد بنایا ہے، جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ

وہ سابقہ اقوام کے قصص اور تاریخ کے بیان میں ضعیف، موضوع، منکر اور ہر قسم کی روایات کو بنیاد بنانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے ہیں۔ دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ قدیم مصری فرعونی اور قبطی تہذیب اور فکر سے متاثر تھے اور اس تاثر کی جھلک ان کے ڈراموں "أصحاب الكهف" اور "عودة الروح" میں صریحاً نظر آتی ہے۔ بعض سلفی علماء نے ان پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ انہوں نے اپنی بعض تحریروں اور ڈراموں کو وحدت الوجود کا عقیدہ پھیلانے اور عام کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔

ان پر ایک اعتراض یہ بھی عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں مصری اخبار "الأهرام" میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ "حديث مع و إلى الله" کے عنوان سے ایک تخیلاتی مکالمہ شائع کرنا شروع کیا جس میں وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حضور سُوئے ادب کے مرتکب ہوئے ہیں۔ بعض مصری علماء اور شیوخ نے ان پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ اس مکالمے میں وہ خود ہی اللہ سے ہم کلام ہوتے ہیں اور پھر اللہ کی طرف سے جواب بھی اپنے تخیلات اور افکار کے مطابق دیتے ہیں۔ علماء کا کہنا یہ تھا کہ اگر کوئی شخص دعا اور مناجات میں اللہ سے ہم کلام ہو تو اس کی گنجائش تو موجود ہے لیکن اللہ سے کلام کے دوران اپنی ہی بات اور جواب کو اللہ کا جواب اور کلام قرار دیتے ہوئے اسے بطور مکالمہ شائع کرنا اللہ پر بہتان کے مترادف ہے۔ چونکہ توفیق الحکیم نے اپنے مکالمے میں اللہ کی طرف سے جو جواب دیا ہے وہ اللہ کا کلام یا جواب نہیں ہے لہٰذا اس کی نسبت بھی اللہ کی طرف درست نہیں ہے۔

توفیق الحکیم کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا کہنا یہ تھا کہ مغرب میں سائنسی علوم کے ماہرین اور موجدین کو کائنات میں غور و فکر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حقیقی معرفت حاصل ہے اور اس کے عوض وہ جنت میں داخل ہوں گے اور جنت میں داخلے کے لیے کلمہ شہادت کا اقرار کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ ان پر یہ اعتراض بھی عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے آخرت میں اللہ کی رؤیت کا انکار کیا ہے۔ توفیق الحکیم کا کہنا یہ بھی تھا کہ عربی اور یہودی فکر میں ثقافتی تعاون بڑھانا چاہیے اور امن و سلامتی کے حصول کی خاطر

ایک عرب اسرائیل جمعیت کا قیام عمل میں لانا چاہیے جس کا صدر دفتر فرانس میں ہو۔ ان پر ایک اعتراض یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ ان کے بقول مذہب کی ابتدا کا سبب انسانی خوف بنا ہے اور عامۃ الناس نے اپنے خوف کے خاتمے کے لیے شریر ارواح سے رابطے کیے اور کہانت کا مذہب وجود میں آ گیا۔ اس کے بعد اسلام کی ابتدا ہوئی اور اس نے اللہ رسول اور کتب سماویہ کی تعلیمات سے متعارف کروایا۔ ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کے بقول تمام ادیان نسبی اور اضافی (relative) ہیں لہٰذا اپنی اپنی جگہ تمام ادیان صحیح ہیں۔ اسی فکر کی بنیاد پر انہوں نے سماوی ادیان کے اتحاد و اتفاق کی دعوت دی۔ ان پر یہ اعتراض بھی وارد کیا گیا ہے کہ وہ اسلام اور اشتراکیت میں موافقت کے قائل تھے۔ اسی طرح وہ شریعت اسلامیہ کی تشکیل جدید کے بھی داعی تھے۔ انہوں نے فرشتوں اور جنات کے عالم کے بارے بھی میں کچھ عجیب و غریب خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے اس قسم کے افکار پر ڈاکٹر علی سید احمد سید نے اپنی ایک کتاب "فکر توفیق الحکیم فی میزان الإسلام" میں مفصل نقد کیا ہے۔

خلاصہ کلام:

توفیق الحکیم کی کتب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اور اسلام کے بارے میں ان کی معلومات انتہائی ابتدائی اور سطحی تھیں لہٰذا وہ کسی طور بھی اس بات کے اہل نہیں تھے کہ فکر اسلامی جیسے دقیق اور نازک موضوع پر اپنی آراء و افکار کا اظہار فرماتے۔ اگر وہ اپنی خدمات عربی زبان و ادب تک ہی محدود رکھتے تو شاید علماء کو ان پر نقد کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ایسی شخصیات اور اعلام پر علماء کی طرف سے اسی وقت نقد سامنے آتی ہے جب یہ حضرات اپنے ادبی سیاسی، معاشرتی یا دنیاوی مقام کو بنیاد بناتے ہوئے اُمتِ مسلمہ کے رہنما بننے کی کوشش کرتے ہیں اور فکر اسلامی جیسے نازک موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے عوام الناس میں فکری انتشار اور عقیدے کے بگاڑ کا باعث بن جاتے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی

پیدائش اور ابتدائی و اعلیٰ تعلیم: ڈاکٹر یوسف قرضاوی جمہوریہ عربیہ مصر میں ایک

گاؤں "صفت تراب" میں ۹ ستمبر ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے اور تا حال حیات ہیں۔ ان کی عمر اس وقت پچاسی برس کے لگ بھگ ہے۔ دو سال کی عمر میں ہی یتیم ہو گئے تھے اور ان کی پرورش ان کے چچا نے کی۔ انہوں نے دس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی قرآن کریم مکمل طور پر حفظ بھی کر لیا اور اس کی تجوید کا علم بھی حاصل کر لیا تھا۔ اپنی پرائمری، مڈل اور ہائی سکول کی تعلیم انہوں نے جامعہ ازہر سے ملحق "معہد العلوم الإسلامية" سے حاصل کی۔ بعد ازاں جامعہ ازہر میں عربی زبان و ادب کے شعبہ سے ۱۹۵۴ء میں اپنی گریجویشن مکمل کی۔ ۱۹۵۸ء میں انہوں نے "معہد الدراسات العربية العالية فی اللغة والأدب" سے ڈپلومہ مکمل کیا۔ ۱۹۶۰ء میں جامعہ ازہر ہی میں کلیہ اصول الدین سے اپنا ایم اے مکمل کیا، جبکہ ۱۹۷۳ء میں اسی کلیہ سے "الزكاة وأثرها في حل المشاكل الاجتماعية" کے عنوان سے پی ایچ ڈی مکمل کی۔

خاندان:

۱۹۵۸ء میں ایک مصری خاتون "إسعاد" سے شادی کی اور اس بیوی سے ان کے چار بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ دوسری شادی انہوں نے ایک الجزائری خاتون سے اسّی (۸۰) کی دہائی میں کی۔ ان کے تین بچوں نے ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کیا ہوا ہے۔ ان کی ایک بیٹی 'الہام قرضاوی" عالمی شہرت یافتہ نیوکلر سائنسدان ہے اور اس نے فزکس میں پی ایچ ڈی مکمل کی ہے۔ ان کی ایک دوسری بیٹی 'اسہام قرضاوی" نے کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کی ہے۔ ان کے ایک بیٹے عبد الرحمن یوسف، مصر کے معروف شاعر اور سیاسی طور پر بھی کافی متحرک آدمی ہیں۔

عالمی دینی، علمی اور اقتصادی اداروں کی سربراہی:

شیخ قرضاوی عالم اسلام کی کئی ایک معروف عالمی فقہ اکیڈمیوں، علمی مجالس اور تعلیمی اداروں کے سربراہ اور رکن رہے ہیں یا تا حال ہیں۔ انہوں نے ۱۹۶۱ء میں قطر کی طرف ہجرت کی اور انہیں وہاں کی شہریت مل گئی۔ ۱۹۷۷ء میں انہوں نے قطر یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ اور علوم شرعیہ کی فیکلٹی کی بنیاد رکھی اور اس کے پہلے ڈین

(dean) مقرر ہوئے اور ۱۹۹۰ء تک اس کے ڈین رہے۔ اسی سال انہوں نے قطر میں ہی ''مرکز بحوث السنة والسيرة النبوية'' کی بنیاد رکھی اور تا حال اس کے مدیر ہیں۔

علاوہ ازیں شیخ قرضاوی یورپین ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے لیے آئر لینڈ میں قائم یوروپین فقہی مجلس یعنی ''مجلس الأوروبی للإفتاء والبحوث'' کے صدر ہیں۔ اسی طرح شیخ قرضاوی مصر میں قائم عالمی فقہ اکیڈمی ''مجمع البحوث الإسلامية'' کے رکن ہیں۔ کسی دور میں پاکستان سے علامہ یوسف بنوری صاحب بھی اس اکیڈمی کے رکن رہے ہیں۔ اسی طرح شیخ قرضاوی مکہ مکرمہ میں قائم رابطہ عالم اسلامی کے ماتحت فقہی اکیڈمی ''مجمع الفقه الإسلامی'' کے بھی رکن ہیں۔ علاوہ ازیں قطر اسلامی بینک (قطر) اور فیصل اسلامی بینک (بحرین) کی شریعہ ایڈوائزنگ کمیٹی کے سربراہ ہیں۔ شیخ یوسف قرضاوی سوئٹزر لینڈ میں قائم بینک ''التقویٰ'' کے اساسی شیئر ہولڈر اور شریعہ ایڈوائزر رہے ہیں۔ امریکہ نے اس بینک کے قیام کو مالیاتی دہشت گردی کا نام دیا اور امریکن سیکورٹی کونسل نے اس پر القاعدہ کے ساتھ مالی تعاون کا الزام بھی عائد کیا۔ ۱۲ اگست ۲۰۱۰ء کو یہ الزام اس بینک سے اٹھا لیا گیا۔

شیخ قرضاوی آکسفورڈ یونیورسٹی میں قائم ''سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز'' کے ٹرسٹیز میں سے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ بھی کسی زمانہ میں اس سنٹر کے صدر رہے ہیں۔

علاوہ ازیں افریقہ میں دعوت اسلامی کے فروغ کے لیے قائم منظم ادارے ''منظمة الدعوة الإسلامية'' کے ٹرسٹیز میں سے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ کویت میں قائم زکوۃ کے عالمی ادارے ''الهيئة الشرعية العالمية للزكاة'' کے نائب صدر ہیں۔

وہ کئی سال تک پہلے اسلامی بینک یعنی دوبئی اسلامی بینک کے اعزازی شریعہ ایڈوائزر کے طور پر کام کرتے رہے۔ وہ قطر اسلامی بینک، قطر انٹرنیشنل اسلامی بینک، فیصل اسلامی بینک بحرین، تقویٰ بینک سوئٹزر لینڈ کی شریعہ ایڈوائزنگ کمیٹی کے صدر بھی ہیں۔ اسی طرح وہ فیصل اسلامی بینک مصر کی مینیجنگ کمیٹی کے رکن اور جمعیت اقتصاد اسلامی مصر کے تاسیسی رکن ہیں۔ شیخ قرضاوی ''The Message'' کی طرح ملین

ڈالرز کی کھپت سے بننے والے نئی اسلامک مووی "Muhammad" کے شریعہ ایڈوائزر بھی رہے۔

عالم اسلام میں اثر و نفوذ:

شیخ قرضاوی عالم اسلام میں بہت گہرا اور بڑا اثر و نفوذ رکھنے والے چند بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا ٹی وی پروگرام "الشریعۃ والحیاۃ" عرب دنیا میں بہت ہی معروف پروگرام شمار ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس پروگرام کو سننے والے افراد کی تعداد تقریباً چار کروڑ ہے۔ اس پروگرام کو "الجزیرۃ" ٹیلی ویژن نشر کرتا ہے۔ شیخ قرضاوی اس وقت انگریزی زبان میں فتاوی کی معروف ویب سائیٹ "اسلام آن لائن" میں صدر مفتی کے طور پر بھی کام کر رہے ہیں۔ ۲۰۰۸ء میں "فارن پالیسی" میگزین نے ان بیس افراد میں شیخ محمد یوسف قرضاوی کو تیسرے نمبر پر رکھا جو دنیا بھر میں دانشوروں (intellectuals) کے طبقہ میں گہرا اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔

۸ مئی ۲۰۰۹ء کو جب اللہ کے رسول ﷺ کی طرف منسوب خاکے شائع کرنے والے ڈنمارک کے اخبار کا ایک نمائندہ قطر میں کسی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے آیا تو شیخ قرضاوی نے حکومت قطر پر کڑی تنقید کی کہ انہوں نے کیوں اس صحافی کو قطر میں داخلے کی اجازت دی۔ حکومت قطر نے بعد ازاں یہ کہہ کر معذرت پیش کی کہ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ اس صحافی کا تعلق اس بدنام زمانہ اخبار سے ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "وسائل الأعلام" میں شیخ قرضاوی کے عالم اسلام میں اثر و نفوذ کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی مساعی و جدوجہد کی تحسین فرمائی ہے۔

الاخوان المسلمون سے تعلق:

ڈریم چینل کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ میں نے امام حسن البناء کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مجھے بعد ازاں الاخوان المسلمون کی قیادت کی بھی پیشکش کی گئی لیکن میں نے ایک جماعت کی نسبت تمام امت کے لیے ایک روحانی پیشوا ہونے کو زیادہ پسند کیا۔ مجھے الاخوان سے محبت ہے اور میں

انہیں صراط مستقیم سے نزدیک تر گروہ سمجھتا ہوں۔ شیخ قرضاوی کو دو مرتبہ الاخوان کی طرف ۱۹۷٦ء اور ۲۰۰۴ء میں صدارت اور قیادت کی پیشکش کی گئی لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔

۱۹۴۹ء میں شاہ فاروق کے زمانے میں ان کو اخوان سے تعلق کی وجہ سے قید کیا گیا۔ اس کے بعد جمال عبد الناصر کے زمانے میں بھی انہوں نے تین دفعہ جیل کاٹی۔ پہلی دفعہ جنوری ۱۹۵۴ء میں جیل بھیجے گئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد رہا ہو گئے لیکن نومبر ۱۹۵۴ء میں پھر تقریباً ۲۰ ماہ کے عرصہ تک جیل میں رہے۔ تیسری مرتبہ ۱۹٦۳ء میں جیل بھیجے گئے۔ انہوں نے ''الإخوان المسلمون سبعون عاما فی الدعوة والتربیة والجهاد'' نامی کتاب لکھی ہے، جس میں انہوں نے اخوان کی ابتداء سے لے کر بیسویں صدی کے اخیر تک اس کی ستر سالہ کاوشوں کا جائزہ لیا ہے۔

دعوتی اور تحریکی کام:

شیخ قرضاوی کا کہنا یہ ہے کہ وہ ۱۵ سال کے تھے جب انہوں نے دعوت اور تحریک کا کام شروع کیا، یعنی ان کے دعوتی اور تحریکی کام کی عمر اس وقت ۷۰ سال ہے۔ شیخ قرضاوی متفرق مواقع پر شعر بھی کہتے رہے ہیں۔ ان کے یہ اشعار ''نفحات ولفحات'' کے عنوان سے ایک جگہ جمع کر دیے گئے ہیں۔ ذیل میں ہم نمونے کے طور پر ان کے چند اشعار بیان کر رہے ہیں جو انہوں نے اخوانی بھائیوں کے ساتھ جیل کے دوران کہے تھے۔ یہ ان کا ایک مکمل قصیدہ ہے جو تقریباً ۳۰۰ اشعار پر مشتمل ہے اور ''ملحمة الإبتلاء'' کے نام سے معروف ہے۔ اس قصیدہ کے یہ آخری اشعار ہیں جو ان کے جذبہ ایمانی، فکر کی پختگی اور تحریکی مزاج کا اظہار کر رہے ہیں۔ شیخ فرماتے ہیں:

تا الله ما الطغیان یهزم دعوة
یوما وفی التاریخ بریمینی
ضع فی یدی القید ألهب أضلعی
بالسوط ضع عنقی علی السکین
لن تستطیع حصار فکری ساعة

أو نزع إيماني ونور يقيني

فالنور في قلبي وقلبي في يدي

ربي...وربي ناصري ومعيني

سأعيش معتصما بحبل عقيدتي

وأموت مبتسما ليحيا ديني

''اللہ کی قسم! ظلم واستبداد اس دعوت کو ایک دن کے لیے بھی شکست نہیں دے سکتا اور تاریخ میری اس قسم پر گواہ ہے۔ اگر تم میرے ہاتھوں میں زنجیریں ڈال دو، میرے سینے کو کوڑوں کی بارش سے آگ لگا دو اور میری گردن چھری پر رکھ دو تب بھی تم ایک لمحے کے لیے بھی میری فکر کو گھیرا نہیں ڈال سکتے اور نہ ہی میرا ایمان اور میرے دل کا یقین ایک گھڑی کے لیے بھی باہر نکال سکتے ہو۔ میرا نور میرے دل میں ہے اور میرا دل میرے رب کے ہاتھ میں ہے...اور میرا رب میرا حامی و مددگار ہے۔ اپنے اپنے عقیدے اور فکر کو مضبوطی سے تھامے ہوئے اپنی زندگی گزاروں گا اور موت کو ہنس کر گلے لگاؤں گا تا کہ میرا دین زندہ رہے۔''

اسرائیل اور امریکہ کے بارے شیخ قرضاوی کا موقف:

اسرائیل اور اسرائیلی یہودیوں کے بارے میں شیخ قرضاوی کا موقف بہت ہی سخت ہے۔ شیخ قرضاوی نے ''مجمع الفقه الإسلامي'' کے چودہویں اجلاس منعقدہ قطر مؤرخہ ۱۱تا۱۶ جولائی ۲۰۰۳ء میں اسرائیلی افواج اور شہریوں دونوں پر خودکش حملوں کو جائز قرار دیا۔ ان کا فتویٰ یہ بھی تھا کہ اسرائیلی خواتین اور بچوں کا بھی خودکش حملوں میں قتل عام جائز ہے کیونکہ ان کے بقول اسرائیل کے شہری (civilians) بھی حربی کفار میں داخل ہیں اور اسرائیل ایک عسکری معاشرہ (militarised society) ہے۔ اسرائیلی بچوں کے بارے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ بچے اسرائیلی ریاست کی تربیت کی وجہ سے بڑے ہو کر لازماً حربی کفار ہی بنیں گے، اس لیے اسرائیل میں کیے گئے خودکش حملوں میں ان یہودی بچوں کا قتل ہونا بھی جائز ہے۔

واضح رہے کہ قرضاوی صاحب کا خودکش حملوں سے متعلق یہ فتویٰ صرف اسرائیل

کے بارے میں ہے اور ایسے حملوں کی اجازت وہ فلسطین اور اسرائیل کے علاقوں میں ہی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس قطر میں ایک بم دھماکے کے بعد انہوں نے ۲۰ مارچ ۲۰۰۵ء کو ایک فتویٰ جاری کیا جس کے مطابق انہوں نے اسلامی ممالک میں غیر مسلم شہریوں پر حملوں کی مذمت کی۔

۱۴/اپریل ۲۰۰۴ء کو "اسلام آن لائن" پر شیخ قرضاوی کا یہ فتویٰ جاری ہوا کہ امریکی اور اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ امریکی اور اسرائیلی مصنوعات کی خریداری میں شامل ہمارا ایک ایک درہم اور دینار ہمارے ہی مسلمان بھائیوں کے سینوں میں گولیوں کی صورت میں واپس کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکی اور اسرائیلی مصنوعات کی ایڈورٹائزنگ بھی مسلمانوں کے لیے شرعاً جائز نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ اس وقت دوسرا اسرائیل ہے اور امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ مالی تعاون صیہونیت (Zionism) کو مالی امداد فراہم کرنا ہے۔ شیخ یوسف قرضاوی کا کہنا یہ بھی ہے کہ جب امریکی کار کی موجودگی میں اسی معیار کی جاپانی کار موجود ہے تو پھر امریکی کار کو خریدنا کیسے شرعاً جائز ہو سکتا ہے؟ شیخ قرضاوی امریکی اور اسرائیلی مصنوعات کی خریداری کو گناہِ کبیرہ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مسلمان صیہونیت کے خلاف ہیں کہ جس کا اسرائیل مدعی ہے، نہ کہ ان یہودیوں کے خلاف جو اصل تورات پر ایمان رکھتے ہیں۔

شیخ قرضاوی نے مئی ۲۰۰۱ء میں اسرائیلی وزیر اعظم ایریل شیرون کے قطر میں آمد پر کہا کہ ایریل شیرون کو قطر میں داخل نہیں ہونا چاہیے تھا اور جس شخص نے اس ظالم خونی سے مصافحہ کیا تو میں یہ کہتا ہوں کہ وہ اپنے ہاتھ ستر مرتبہ دھوئے۔ اسرائیل کے خلاف اس قدر سخت موقف کی بنا پر اسرائیل میں ان کے داخلے پر پابندی عائد ہے۔ اسی طرح ۱۹۹۹ء میں ان کے امریکہ میں داخلے پر بھی پابندی لگائی گئی اور ۲۰۰۸ء میں ان پر برطانیہ میں داخلے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔

شیخ قرضاوی اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق کے حامی ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ

اسلام عیسائیوں یا یہودیوں یا بت پرستوں کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کرتا بشرطیکہ وہ مسلمانوں سے جنگ کرنے والے نہ ہوں یعنی حربی کافر نہ ہوں۔

شیخ قرضاوی اور معاصر جہاد:

شیخ قرضاوی سے جب عراق میں امریکہ کے خلاف جہاد کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ یہ جہاد جائز ہے، بلکہ انہوں نے امریکی افواج کے خلاف مزاحمت کو اہل عراق اور پڑوسی مسلمانوں کے لیے فرضِ عین قرار دیا۔ اس کے بعد ان سے سوال ہوا کہ کیا یہ جہاد عراق میں موجود امریکی شہریوں سے بھی ہو گا؟ تو انہوں نے کہا کہ عراق میں کون سے امریکی شہری موجود ہیں ؟ یعنی عراق میں تو سارے امریکی حربی کفار ہیں کیونکہ وہ جنگ ہی کے لیے وہاں آئے ہیں۔ اس فتویٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیج کے معروف اخبار "الشرق الأوسط" نے یہ خبر لگائی کہ قرضاوی کے نزدیک امریکی شہریوں کو قتل کرنا جائز ہے اور ان کے نزدیک قتال بھی فرضِ عین ہے۔ شیخ قرضاوی نے اس اخبار کی اس خبر کے بیان کے بعد اپنے موقف کی دوبارہ وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ امریکی شہریوں کو قتل کرنا جائز ہے بلکہ انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ عراق میں کون سے امریکی شہری موجود ہیں؟ یعنی ان کا فتویٰ یہی ہے کہ حربی امریکی کو قتل کرنا جائز ہے، البتہ اس میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ کون سا امریکی حربی ہے یا نہیں؟ پس قرضاوی صاحب نے عراق میں موجود تمام امریکیوں کو حربی قرار دیا ہے جیسا کہ وہ اسرائیلیوں کو حربی قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح قتال فرضِ عین کے بارے میں انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے فتویٰ میں قتال کا لفظ استعمال نہیں تھا بلکہ میں نے مقاومت یعنی امریکی افواج کے خلاف ہر قسم کی مزاحمت کو ہر مسلمان کے لیے فرضِ عین قرار دیا تھا۔

معروف سعودی عالم دین شیخ عبد اللہ بن جبرین کے ایک فتویٰ، کہ مسلمانوں کے لیے ایرانی شیعہ جماعت حزب اللہ کے لیے دعا کرنا یا اس کی مدد کرنا جائز نہیں ہے، کے جواب میں شیخ قرضاوی نے اسرائیل کے خلاف برسرِ پیکار شیعہ جماعت حزب اللہ کی

حمایت اور امداد کرنے کا فتویٰ جاری کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ کافر اور ظالم اسرائیلی یہودیوں کے خلاف بر سر پیکار کلمہ گو بدعتی اہل تشیع کے ساتھ تعاون کرنا جائز اور حکمت کا تقاضا ہے۔ شروع میں انہوں نے افغانستان میں بدھا کے مجسمے گرانے پر طالبان پر تنقید کی تو انہیں بت پرست ہونے کے طعنے بھی دیے گئے۔ بعد ازاں طالبان کے ایک وفد سے ملاقات کے بعد انہوں نے اپنے اس موقف پر نظر ثانی کرتے ہوئے اسے تبدیل کر لیا۔

شیخ قرضاوی پر معاصر جہاد کے حوالے سے ان کے ایک فتویٰ پر علمائے اسلام کی طرف سے شدید تنقید ہوئی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں شیخ قرضاوی نے کہا تھا کہ امریکی فورسز میں ملازم مسلمان امریکیوں کے لیے امریکی عتاب سے اپنی جان بچانے کی خاطر امریکی فورسز کے ساتھ مل کر افغانستان کے مسلمانوں سے قتال جائز ہے۔ معروف عالم دین اور داعی اسلام صلاح الدین سلطان نے ان کا اس فتویٰ سے رجوع بھی نقل کیا ہے۔

شیخ قرضاوی نے فلسطینی صدر محمود عباس کی غزہ کی جنگ میں شرکت کے ثابت ہونے پر اسے رجم کرنے کا فتویٰ جاری کیا، جس کے جواب میں محمود عباس کی وزارتِ اوقاف کے ائمہ مساجد نے اپنے خطباتِ جمعہ میں شیخ قرضاوی پر خوب چڑھائی کی۔

اکتوبر ۲۰۰۴ء میں دنیا کے تقریباً ۲۵۰۰ کے قریب روشن خیال مسلمان مفکرین نے شیخ قرضاوی کے خلاف ایک قرارداد پاس کرتے ہوئے انہیں "شیخ الموت" قرار دیا اور ان پر بنیاد پرستی اور عدم برداشت کا الزام عائد کیا۔

شیخ قرضاوی کی کتب:

شیخ قرضاوی نے تقریباً ہر شعبہ زندگی، عقائد، نظریات، عبادات، معاملات، معاشیات، سیاسیات اور معاشرتی مسائل سے متعلق کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی کئی ایک کتابوں کو قبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ انہوں نے شیخ ازہر محمود شلتوت کی خواہش پر "الحلال والحرام في الإسلام" نامی کتاب لکھی۔ کہا جاتا ہے کہ عالم اسلام میں اس کے مقابلے میں شائع ہونے والی کوئی اور کتاب نہیں ہے۔ استاذ محمد مبارک نے اسے اپنے موضوع پر بہترین کتاب قرار دیا۔ شیخ طنطاوی رحمہ اللہ مکہ مکرمہ میں یہ کتاب طلبہ کو سبقاً

سبق اُپڑھاتے تھے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کتاب کی احادیث کی تخریج و تحقیق کی ہے۔ عربی زبان میں اس کے چالیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں انگریزی، جرمن، اردو، ترکی، ملائشین، انڈونیشین، چینی، ہسپانوی، سواحلی اور دیگر کئی ایک زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب کی بعض مباحث پر مستند علماء نے نقد بھی کی ہے۔ معروف سعودی عالم دین شیخ صالح الفوزان کی اس کتاب پر آڈیو نقد بعنوان "الإعلام فی نقد کتاب الحلال والحرام" درج ذیل ایڈریس سے ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے۔[1] شیخ قرضاوی کی کتاب "فقہ الزکوۃ" بھی زکوۃ کے قدیم اور جدید مسائل پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ مودودی رحمہ اللہ نے اس کتاب کو بیسویں صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔

علامہ قرضاوی کی دیگر معروف کتب میں الشیخ أبو الحسن الندوی کما عرفته، فوائد البنوک هی الربا الحرام، الفتوىٰ بین الانضباط والتسیب، فقه الزکوة، الحلال والحرام فی الإسلام، ملامح المجتمع المسلم الذی ننشده، الإیمان والحیاة، النیة والإخلاص، الإسلام والعلمانیة وجها لوجه، الصحوة الإسلامیة وهموم الوطن العربی والإسلامی، فی فقه الأولویات دراسة جدیدة فی ضوء القرآن والسنة، أولویات الحرکة الإسلامیة فی المرحلة القادمة، الحیاة الربانیة والعلم، التوکّل، مدخل لمعرفة الإسلام، من أجل صحوة راشدة تجدد الدین وتنهض بالدنیا، فتاوىٰ معاصرة، الاجتهاد فی الشریعة الإسلامیة، غیر المسلمین فی المجتمع الإسلامی، فقه الصیام، الصحوة الإسلامیة بین الجحود والتطرف، تاریخنا المفترى علیه، الإسلام والفن، الدین والسیاسة، مع أئمه التجدید ورؤاهم فی الفکر والإصلاح، نحن والغرب، فقه اللهو والترویح، القدس قضیة کل مسلم، بینات الحل الإسلامی وشبهات العلمانیین والمتغربین، ظاهرة الغلو فی

[1] http://www.mediafire.com/?nmyhju2mtm

التکفیر، الصحوۃ الإسلامیة بین الاختلاف المشروع والتفرق المذموم، حقیقة التوحید، الفقة الإسلامی بین الإصالة والتجدید، شریعة الإسلام صالحة لکل زمان ومکان اور مدخل لدراسة السنة النبویة وغیرہ ہیں۔

آراء اور فتاویٰ:

شیخ قرضاوی نے اپریل ۲۰۰۸ء میں قطر میں منعقدہ ایک کانفرنس میں گرین وچ کی بجائے مکہ مکرمہ کے وقت کو ساری دنیا کے وقت کے لیے معیار بنانے کی رائے بیان کی، کیونکہ مکہ مکرمہ جغرافیائی اعتبار سے دنیا کا اصل مرکز قرار پاتا ہے، جبکہ اس وقت ساری دنیا کے ممالک کا معیاری وقت گرین وچ ٹائم ہے۔

شیخ قرضاوی نے سگریٹ اور تمباکو نوشی کو خبائث میں سے قرار دیتے ہوئے اسے حرام کہا ہے۔ انہوں نے اس کی حرمت کی بنیاد مال کو آگ لگانا اور صحت انسانی کو نقصان پہنچانا بنایا ہے۔ ڈاکٹر قرضاوی کا کہنا یہ ہے کہ یہ کسی فقیہ یا مفتی کا کام نہیں ہے کہ وہ یہ بتلائے کہ تمباکو یا سگریٹ نوشی انسانی صحت کے لیے مفید ہے یا ضرر رساں، بلکہ یہ ڈاکٹرز اور میڈیکل سائنس کے علماء کا منصب ہے اور اطباء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تمباکو نوشی انسانی صحت کے لیے مضر ہے اور کئی ایک موذی امراض کا سبب ہے، لہٰذا یہ حرام ہے، کیونکہ شریعتِ اسلامیہ میں ہر ایسی شے حرام ہے جو انسانی صحت کے لیے مضر ہو۔ پس ﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ کے حکم قرآنی کے مطابق تمباکو نوشی حرام ہے۔ اسی طرح حکم قرآنی ﴿وَلَا تُسْرِفُوْا﴾ کے مطابق بھی تمباکو نوشی حرام قرار پائے گی، کیونکہ قرآن نے اسراف کو حرام قرار دیا ہے اور تمباکو نوشی مال کو آگ لگانے کے مترادف ہے، لہٰذا حرام ہے۔ انہوں نے حدیث مبارکہ ''لَا ضَرَرَ وَ لَا ضِرَارَ'' یعنی نہ تو ضرر اٹھاؤ اور نہ ہی کسی کو ضرر پہنچاؤ، سے بھی اس کی حرمت پر استدلال کیا ہے۔

اسلامک بینکنگ کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں شیخ قرضاوی نے کہا کہ اسلامک بینکنگ کا تجربہ نظریاتی میدان سے عملی میدان کی طرف ایک اچھی پیش رفت اور وقت کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے ایک دور تھا جس میں یہ سوچنا یا کہنا بھی

ناممکن تھا کہ بینک کا ادارہ سود کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایسا دور آیا جس میں بینک کے سود کی حرمت اور شناعت خوب اچھی طرح اجاگر ہوئی اور اسلامک بینکنگ کے بارے میں نظریاتی مباحث سامنے آنے لگے۔ اس کے بعد ایک تیسرا دور آیا جس میں عملاً اسلامی بینکنگ کا آغاز ہوا۔ انہوں نے کہا ابھی ہم تیسرے دور میں ہیں اور نہ ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں اور نہ ہی اسلامک بینک یہ کہتے ہیں کہ ان کی یہ بینکنگ سو فی صد اسلامی اور شرعی اصولوں کے مطابق ہے۔ شیخ قرضاوی کے مطابق ابھی چوتھا دور باقی ہے جس میں یہی اسلامی بینکنگ ممکن حد تک شرعی اصولوں کے مطابق ہو جائے گی۔ پس اس اعتبار سے موجودہ اسلامی بینکنگ حقیقی اسلامی بینکنگ کی طرف ایک مثبت پیش رفت ہے اور اس کی اس اعتبار سے حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ انشورنس سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ جمہور فقہاء تجارتی اور لائف انشورنس کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور میری رائے میں بھی یہ ممنوع اور ناجائز ہے۔

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ مفکرین، علماء اور سیاسی رہنماؤں کے مجسمے سڑکوں، گھروں یا عوامی مقامات پر نصب کرنا حرام ہے اور اگر یہ مجسمہ کسی ایسے شخص کا ہو جس سے کسی قسم کی عقیدت یا تعظیم بھی وابستہ ہو تو اس کی حرمت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کہا کہ صرف بچوں کے کھلونے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ غیر مسلم مغربی اور یورپین ممالک میں رہائش پذیر ہونے سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں یہ رہائش اختیار کرنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے اور اگر مسلمانوں کے لیے ان علاقوں میں رہائش پذیر ہونا مطلقاً حرام ہوتا تو وہاں اسلام کیسے پھیلتا؟ یا پھیلے گا؟ شیخ قرضاوی نے کہا کہ جو مسلمان مغربی معاشروں میں اپنے، اپنے بچوں اور اپنے خاندان کے دین کی حفاظت نہیں کر سکتے تو انہیں مسلمان ممالک کی طرف واپس ہجرت کر جانی چاہیے۔

اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے شادی جائز ہے۔ بعض

حنفی علماء نے اس مسئلے میں حربی اور غیر حربی عورتوں کا فرق بھی کیا ہے۔ شیخ قرضاوی نے اس فرق کی تحسین کرتے ہوئے اس رائے کو اختیار کیا ہے کہ حربی یہودی یا عیسائی عورت سے شادی جائز نہیں ہے، چاہے وہ پاکدامن ہی کیوں نہ ہو جبکہ غیر حربی پاکدامن عورت سے شادی جائز ہے۔ شیخ قرضاوی نے اسرائیلی یہودی عورت سے شادی مطلقاً ناجائز قرار دی ہے کیونکہ ان کی نظر میں اسرائیل میں سب حربی کفار ہیں۔

امریکہ میں مردوں کی امامت کروانے والی بدنام زمانہ خاتون امینہ ودود کے فتنہ کے پیدا ہونے کے بعد عورتوں کی امامت سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں پہلی دفعہ اس خاتون نے یہ کام کیا ہے کہ مردوں کو امامت کروائی ہے اور جمعہ کا خطبہ بھی دیا ہے۔ انہوں نے کہا فرائض اور جمعہ کی نماز کی امامت صرف مردوں کے لیے ہے۔ ہاں! اگر صرف عورتیں ہوں جیسا کہ تراویح وغیرہ کی نماز ہے تو وہاں عورت بھی امامت کرواسکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آٹھوں مذاہب و مسالک کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت کے لیے فرائض کی امامت جائز نہیں ہے۔

شیخ قرضاوی نے ایک سوال کے جواب میں عورت کے لیے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے علاوہ سارے جسم کو ستر قرار دیا ہے اور اس کے ڈھانپنے کو واجب اور اس کے دیکھنے کو حرام کہا ہے، لیکن ان کے بقول عورت کا چہرہ اس کے ستر میں داخل نہیں ہے، لہٰذا عورت کے لیے اپنا چہرہ کھلا رکھنا جائز ہے۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اتفاقاً یا کبھی کبھار کسی عورت کے ہاتھ، پاؤں یا چہرے پر بغیر شہوت کے نظر ڈال لیتا ہے تو ایسی نگاہ بھی جائز ہے، لیکن اگر اس میں شہوت یا تلذذ شامل ہو جائے تو اس کا دیکھنا بھی جائز نہ ہو گا۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام میں جس نظر سے منع کیا گیا ہے وہ کسی عورت کے ہاتھ، پاؤں یا چہرے پر ایسی نظر ڈالنا ہے جو مسلسل ہو یا بار بار ہو یا دیدے پھاڑ کر دیکھنا ہو یا شہوت کے ساتھ ہو یا فتنہ پیدا کرنے والی ہو۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ عورت کے چہرے پر مسلسل یا تکرار کے ساتھ نظر ڈالنا شہوت اور فتنے کا سبب ہے لہٰذا ممنوع ہے۔ ایسی نظر

کے بارے میں شیخ قرضاوی شاعر کا قول نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نظرة فابتسامة فسلام

فكلام فموعد فلقاء

”پہلے نظر پڑتی ہے، پھر مسکراہٹ کا تبادلہ ہوتا ہے اور پھر سلام دعا ہوتی ہے۔
پھر گفتگو کا دور چلتا ہے پھر تاریخ (date) طے ہوتی ہے اور پھر ملاقاتیں
شروع ہو جاتی ہیں۔“

تنہائی کی ان ملاقاتوں کے بعد کیا ہوتا ہے، اسے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔
عورت کا اپنے گھر والوں کی اطلاع اور مرضی کے بغیر اپنے کسی عاشق یا دوست سے نکاح کر لینے کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ طرز عمل درست نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام میں ایسے نکاح کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے جس میں عورت کی رضامندی بھی حاصل ہو اور اولیاء کی بھی۔ کسی بھی نکاح میں دونوں کی رضامندی شرعاً مطلوب ہے لہٰذا نکاح میں لڑکی اور ولی دونوں کی رضامندی ہونی چاہیے۔ انہوں نے ایک ایسی لڑکی کو جو اپنے اولیاء کی مرضی کے بغیر کسی شخص سے نکاح کرنا چاہتی تھی اور اس سے نکاح کرنے کا معاہدہ بھی کر چکی تھی، نکاح سے روک دیا اور اپنے اولیاء کی مرضی کے بغیر لڑکی کے اس تصرف کو باطل قرار دیا۔

جہاد سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ جہاد کی سب سے پہلی قسم وہ جہاد ہے جو مسلمان اُمت میں مغربی استعمار کے باقیات اجنبی حکمرانوں سے آزادی کے لیے ہونا چاہیے۔ جہاد کی دوسری قسم انہوں نے کشمیر، عراق اور شیشان وغیرہ جیسے مقبوضہ علاقوں میں جہاد کو قرار دیا جس میں غیر مسلم حکمرانوں سے مسلمان معاشروں کو آزاد کروانے کے لیے جہاد کرنا ایک دینی ذمہ داری ہے۔ انہوں نے کہا جہاد کی ایک قسم اقتصادی جہاد بھی ہے اور اس سے مراد امریکی اور اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ ہے۔ ان کے نزدیک موجودہ حالات میں امریکی اور اسرائیلی مصنوعات کا استعمال حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔

بینکوں کے سود سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ بینکوں کا سود حرام ہے اور اس کا اپنی ذات کے لیے استعمال کرنا بھی حرام ہے، لیکن اس سود کو بینک کے پاس چھوڑنا بھی حرام ہے، کیونکہ یہ برائی میں تعاون اور سودی بینکنگ کو تقویت دینے کا باعث بنتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ غیر مسلم ممالک میں سودی بینکوں میں سو چھوڑنے کی حرمت تو کئی گنا بڑھ جاتی ہے، کیونکہ کئی ایک مغربی ممالک کے بینک مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی سودی رقم عیسائی مشنریوں کو دے دیتے ہیں اور مسلمانوں کا چھوڑا ہوا یہی سود مسلمانوں ہی کو عیسائی بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کو اپنی رقوم پر بینکوں سے سود وصول کرنے کے بعد اسے غرباء، یتیموں، مساکین، اسلامی مراکز کی تعمیر، دعوت اسلامی کے کاموں، اسلامی کتابوں اور لٹریچر کی نشر و اشاعت اور دیگر خیراتی کاموں میں لگا دینا چاہیے۔ انہوں نے اس فتویٰ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا کہ یہ مال کمانے والے کی نسبت سے خبیث اور حرام ہوتا ہے نہ کہ فی نفسہٖ حرام ہے۔ یعنی بعض اشیاء فی نفسہٖ یا بذاتہٖ حرام ہیں، جیسا کہ شراب، سور وغیرہ، جبکہ بعض اشیاء اصلاً تو حلال ہیں لیکن کسی خارجی سبب سے حرام ہوئی ہیں، جیسا کہ سود کی رقم۔ رقم یا مال بذاتہٖ حلال شے ہے لیکن ایک خارجی سبب سے حرام ہو گیا ہے اور وہ سبب کمانے والا کا حرام فعل ہے۔ پس جب وہ سبب نہ رہے گا تو اس کا حکم بھی نہ رہے۔ لہٰذا سود کا مال اس کے کمانے والے کے لیے تو اس کے فعل حرام کی وجہ سے حرام ہے لیکن کسی دوسرے کے لیے اس کی نسبت تبدیل ہو جانے سے یہ اپنی اصل یعنی حلت کی طرف لوٹ آئے گا۔

ان کے نزدیک سودی بینکوں سے حاصل ہونے والے سود کی چار صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ انسان یہ سودی رقم اپنی ذات کے لیے استعمال کر لے اور یہ حرام ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ سودی رقم بینکوں کے پاس رہنے دے اور یہ بھی حرام ہے، کیونکہ یہ برائی میں تعاون اور سودی نظام کو تقویت دینا ہے۔ تیسرا یہ کہ اس مال کو لے کر آگ لگا دے اور یہ بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ اتلافِ مال شرعاً جائز نہیں ہے۔ چوتھی صورت اس کی

یہ نکلتی ہے کہ اس مال کو خیر کے کاموں میں لگا دے اور اسی کے وہ قائل ہیں۔ بعض شیوخ کی رائے یہ ہے کہ اس کی ایک پانچویں صورت بھی ہو سکتی ہے کہ بینک سے یہ سودی مال لے لینا چاہیے اور کسی ایسی جگہ لگا دینا چاہیے جہاں پہلے ہی حرام کا مال لگ رہا ہو، مثلاً کسی شخص کا بچہ اغوا ہو گیا ہے اور ڈاکو تاوان میں ۲۰ لاکھ مانگ رہے ہیں۔ اب وہ تو حرام کھانے کو تیار بیٹھے ہیں تو انہیں ایسی سودی رقم بطور تاوان دی جا سکتی ہے۔ شیخ قرضاوی ہی کی رائے میں احتیاط اور جواز کی ایک اور صورت بعض اہل علم نے یوں بھی بیان کی ہے کہ بینکوں سے حاصل کردہ سودی رقم غرباء، مساکین وغیرہ کو تو دی جائے لیکن یہ رقم ان کے کھانے اور لباس میں استعمال نہ ہو بلکہ اس کے علاوہ دیگر اشیاء میں استعمال ہو، مثلاً کسی غریب کو کوئی مکان بنوا کر دے دیا جائے یا کسی غریب کو کوئی سائیکل یا ریڑھی وغیرہ لے دی جائے یا گاڑی کے کرایہ وغیرہ میں اس کو ایڈجسٹ کر لیا جائے۔ اسی طرح دعوت و جہاد میں اسی رقم سے اسلحہ وغیرہ خرید کر دشمن کے خلاف استعمال کیا جائے یا کتابیں اور سی ڈیز نشر کر کے اسلام کے خلاف نظریاتی جنگ کا مقابلہ کیا جائے، وغیرہ۔

اہل تشیع سے متعلق ایک سوال کے جواب میں شیخ قرضاوی نے اثنا عشریہ یا امامیہ فرقہ کو ایک بدعتی فرقہ قرار دیا ہے اور انہیں فرقہ ناجیہ سے خارج کہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اہل تشیع کی تکفیر کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک اہل تشیع کے محققین کتاب اللہ کو مکمل کتاب مانتے ہیں اور کلمہ گو ہیں، لہٰذا اہل تشیع کافر نہیں ہیں۔ شیخ قرضاوی کا کہنا یہ ہے کہ اہل تشیع کے بارے میں یہ اہل سنت کا مجمع علیہ عقیدہ ہے کہ وہ انہیں بدعتی فرقوں میں تو شمار کرتے ہیں لیکن بطور فرقہ کافر قرار نہیں دیتے۔ اہل تشیع کو بدعتی قرار دینے پر ایرانی علماء نے ان پر شدید نکتہ چینی کی ہے کیونکہ شیخ عالم اسلامی کے اتحاد کے لیے قائم کی جانے والی عالمی مجلس کے صدر بھی ہیں۔ شیخ قرضاوی عقائد میں اشعری مسلک کی طرف میلان رکھتے ہیں اگرچہ بعض مسائل میں اشعریہ پر نقد بھی کرتے ہیں۔

۲۰۰۸ء میں شیخ قرضاوی نے ادویات اور اشیائے خورونوش میں ۵ء۰ فی صد الکوحل کے استعمال کو جائز قرار دیا کیونکہ ان کے بقول اتنی کم مقدار میں الکوحل کا استعمال بطور اجزاء (ingredients) کے نہیں ہوتا بلکہ تخمیر (fermentation) کے لیے ہوتا ہے۔ اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، معروف سعودی عالم دین شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ اور سعودی عرب میں کبار علماء کی فتویٰ کمیٹی کا بھی یہی موقف ہے۔

شیخ قرضاوی فرشتوں، جنات، عرش، کرسی، عذابِ قبر، پل صراط، میزان، حوضِ کوثر، نزولِ عیسیٰ، خروجِ دجال، خروجِ مہدی، معجزات، کرامات اور قیامت کی دیگر نشانیوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان مسائل میں ان کا وہی عقیدہ ہے جو جمہور اہل سنت کا ہے۔ شیخ قرضاوی کتاب کھول کر یا لائنیں کھینچ کر استخارہ نکالنے کو حرام قرار دیتے ہیں۔ وہ قبر پرستی، تعویذ گنڈا، ارواح کو حاضر کرنے، غیر اللہ کی قسم اٹھانے، غیر اللہ کے لیے نذر ماننے یا ذبح کرنے کی بھی مذمت کرتے ہیں۔

شیخ قرضاوی فلاسفہ، معتزلہ، غالی صوفیاء، اہل تشیع امامیہ اور خوارج کی مذمت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ حلول، اتحاد، خرافات اور بدعات پر مشتمل تصوف کے حامی نہیں ہیں، لیکن قرآنی اور نبوی منہج کے مطابق سنی تصوف کے وہ قائل ہیں کہ جس کے شیوخ حضرت حسن بصری، فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادھم اور جنید بغدادی رحمہم اللہ وغیرہ تھے۔ شیخ قرضاوی فضائل اعمال میں ضعیف احادیث سے استفادہ کے قائل ہیں لیکن حلال و حرام میں نہیں۔

شیخ قرضاوی حدیث و سنت کی حجیت کے قائل اور پُر زور مدعی ہیں لیکن سنت کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ سنت دو قسم کی ہے، ایک تشریعی یعنی جو ہمارے لیے شریعت ہے اور ایک غیر تشریعی ہے یعنی جو ہمارے لیے شریعت نہیں ہے، جیسا کہ طب سے متعلقہ احادیث ہیں۔ انہوں نے احکام سے متعلقہ بعض احادیث کو بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے ساتھ خاص قرار دیا ہے، جیسا کہ گھوڑوں میں زکوۃ نہ ہونے کی روایت کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے لیے تھی

اور آج گھوڑوں میں زکوۃ ہو گی۔

شیخ قرضاوی جمہوریت کے قائل ہیں لیکن وہ مغربی جمہوریت کے ناقد ہیں۔ مغربی جمہوریت کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے جو شرائط وہ تجویز کرتے ہیں، اس کے بعد وہ جمہوریت اسلام کا شورائی نظام بن جاتی ہے، اگرچہ قرضاوی اسے پھر بھی جمہوریت ہی کا نام دیتے ہیں۔ بعض اہل علم نے ان پر اس پہلو سے تنقید کی ہے کہ وہ جمہوریت کے قائل ہیں۔ شیخ قرضاوی کے دفاع میں بعض دوسرے اہل علم کا کہنا یہ بھی ہے کہ شیخ نے جمہوریت کو مسلمان بنانے کے لیے جو شرائط عائد کی ہیں، ان کی روشنی میں اسلام کے شورائی نظام اور شیخ قرضاوی کی پیش کردہ جمہوریت میں سوائے نام کے کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

شیخ قرضاوی اضطراری حالت اور فتنے کے پیدا نہ ہونے کی صورت میں کسی مرد کے عورت کے ساتھ مصافحہ کو جائز سمجھتے ہیں۔ شیخ قرضاوی نے موجودہ زمانے میں ہوائی جہاز کے سفر کے پر امن ہونے کی وجہ سے عورت کے لیے بغیر محرم کے حج اور عمرہ کو جائز قرار دیا ہے اور اس فتویٰ کی بنیاد اس مشہور روایت کو بنایا ہے جس میں اس چیز کا تذکرہ ہے کہ ایک عورت صنعاء سے مدینے تک اکیلی سفر کرے گی اور اسے کسی چیز کا خوف اور ڈر نہ ہو گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن بغیر محرم کے حج اور عمرہ کر لیتی تھیں اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ان پر نکیر نہ فرماتے تھے لہٰذا سفر کے پر امن ہونے کی صورت میں عورت کے لیے اکیلے حج اور عمرہ جائز ہے۔ اسی سے ملتا جلتا فتویٰ مالکیہ اور شوافع کے ہاں بھی موجود ہے۔

شیخ قرضاوی نے علم نافع اور عمل صالح کے حصول کی خاطر مردوں اور عورتوں کے اختلاط کو چھ عدد شرائط کے ساتھ جائز اور شرعی مطلوب قرار دیا ہے۔ اسی طرح شیخ قرضاوی نے موسیقی سننے کو بھی جائز قرار دیا ہے اور اس کے حرام کہنے والوں کے دلائل پر نقد پیش کیا ہے۔ شیخ قرضاوی نشے اور شدید غصے کی حالت میں طلاق کے معاملے میں، کہ جس میں انسان اپنے حواس سے باہر ہو جائے، ان فقہاء کے قول کو اختیار کرتے ہیں جو

ان حالات میں طلاق کے قائل نہیں ہیں۔اسی طرح وہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک شمار کرتے ہیں اور طلاق کے اکثر مسائل میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مسلک کو ترجیح دیتے ہیں۔

ناقدین:

شیخ قرضاوی پر نقد کرنے والوں میں کئی طرح کے لوگ ہیں۔پہلے نمبر پر تو سلفی اہل علم ہیں جو شیخ قرضاوی کو اشعریت کی طرف میلان، اہل تشیع کی تکفیر نہ کرنے، حجاب کے بارے میں نرم موقف اختیار کرنے اور فتویٰ کے اجراء میں تساہل اور سہولت کا منہج اختیار کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ شیخ سلیمان بن صالح الخراشی نے ''القرضاوی فی المیزان'' کے نام سے ایک کتاب شیخ قرضاوی کی توصیف اور تردید میں لکھی ہے۔ہم نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ اکثر مقامات پر شیخ قرضاوی پر الزامات لگاتے ہوئے ان کی عبارتوں سے کھینچ تان کر وہ مفہوم برآمد کیا گیا ہے جو شاید شیخ قرضاوی کی مراد نہ ہو۔ بعض مقامات پر شیخ سلیمان کی نقد درست بھی ہے، جیسا کہ انہوں نے کہا ہے کہ شیخ قرضاوی جنات کے وجود کے تو قائل ہیں لیکن انسانوں پر جنات کے وارد ہونے یا انسانوں کی زبانی جنات کے کلام کرنے یا انسانوں پر جنات کے غالب آنے کے انکاری ہیں، حالانکہ یہ بات صحیح روایات اور مشاہدے سے ثابت ہے۔

جہادی تنظیمیں، امریکی افواج میں شامل مسلمان فوجیوں کے افغانستان میں لڑنے کو جائز قرار دینے کے حوالے سے ، شیخ قرضاوی کے فتویٰ پر نقد کرتی ہیں۔ ہم نے شیخ قرضاوی کے اس تفصیلی فتویٰ کا مطالعہ کیا ہے اور ہمارے خیال میں یہ فتویٰ اس قابل نہیں ہے کہ اسے کوئی علمی رائے قرار دیا جا سکے چہ جائیکہ اس کی اتباع کی جائے کیونکہ نہایت ہی سطحی دلائل پر اس فتویٰ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔اگر تو شیخ قرضاوی کا اس فتویٰ سے رجوع ثابت ہے، جیسا کہ بعض اہل علم نے نقل کیا ہے، تو یہ فتویٰ اسی قابل تھا کہ اس سے رجوع کیا جاتا، اور اگر ایسا رجوع ثابت نہیں ہے تو اس فتویٰ پر نقد وقت کا ایک اہم تقاضا ہے۔

غالی صوفیاء، قبر پرستی، غیر اللہ کے لیے نذر و نیاز، غیر اللہ کے ذبح کرنے وغیرہ کے خلاف فتویٰ دینے کی وجہ سے شیخ قرضاوی کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ ہمیں ان مسائل میں تصوف کے نام پر شرک وبدعات اور خرافات کو رواج دینے پر شیخ قرضاوی کی تنقید سے اتفاق ہے۔ ایرانی علمائے اہل تشیع، شیخ قرضاوی کو امامیہ فرقہ کو بدعتی اور فرقہ ناجیہ سے خارج قرار دینے پر تنقید کرتے ہیں۔

مسلمان معاشروں میں رہائش پذیر سیکولر طبقہ شیخ قرضاوی کے جہاد اور تحریک سے متعلقہ فتاویٰ کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے انہیں شدت پسند اور بنیاد پرست قرار دیتا ہے۔ مغربی مفکرین، صیہونیت، اسرائیل اور امریکہ کے حوالے سے شیخ قرضاوی کے بیانات کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔

بین الاقوامی انعامات:

شیخ قرضاوی کو ان کی دینی، علمی، ثقافتی اور دعوتی سرگرمیوں کی وجہ سے کئی ایک عالمی انعامات سے بھی نوازا گیا ہے، جن میں سے چند ایک کا ذکر ہم ذیل میں کر رہے ہیں:

- انہیں ۱۹۹۱ء میں اسلامی معاشیات میں خدمات کے بدلے ”اسلامک ڈویلپمنٹ بینک پرائز“ دیا گیا۔
- ۱۹۹۴ء میں علوم اسلامیہ میں خدمات کے عوض ”شاہ فیصل انٹرنیشنل پرائز“ دیا گیا۔
- ۱۹۹۷ء میں برونائی کے سلطان نے انہیں ”اسلامک جیورس پروڈنس“ میں خدمات کے عوض انعام دیا۔
- ۱۹۹۹ء میں انہیں ثقافتی اور سائنسی خدمات کے نتیجے میں ”سلطان العویس“ انعام دیا گیا۔
- ۲۰۰۰ء میں انہیں ”دوبئی انٹرنیشنل ہولی قرآن ایوارڈ“ دیا گیا۔
- ۲۰۰۸ء میں علوم اسلامیہ میں خدمات کے عوض حکومت قطر نے ان کے لیے خصوصی انعام جاری کیا۔

- ۲۰۰۹ء میں ملائیشیا حکومت نے انہیں "ہجرت نبویہ" ایوارڈ دیا۔
- ۲۹ ستمبر ۲۰۱۰ء کو شاہ اردن نے انہیں خصوصی انعام عطا کیا۔

خلاصۂ کلام:

شیخ قرضاوی کے فتاویٰ، کتب اور دینی خدمات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بلاشبہ اپنے علم وفضل کی وجہ سے مجتہد کے درجہ پر فائز ہیں، اگرچہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کے ساتھ کسی مسئلے میں اختلاف نہیں کیا جا سکتا یا وہ تنقید سے بالاتر ہستی ہیں۔ اہل علم نے ان کے بعض فتاویٰ پر نقد کی ہے اور ہمارے خیال میں یہ نقد ایسی ہی ہے جیسا کہ امام شافعی، امام ابو حنیفہ پر اور امام محمد، امام مالک ﷭ پر کرتے ہیں۔ اسی طرح امام ابن حزم ﷫، اہل تقلید اور اہل تقلید ظاہریہ پر یا محدثین، اہل الرائے پر اور اہل الرائے، محدثین پر کرتے ہیں۔ ایسی نقد میں اگر گروہی عصبیت، مذہبی تنافر، شخصی تذلیل نہ ہو اور یہ باہمی افہام و تفہیم کے لیے ہو تو یہ شریعت کا مطلوب و مقصود ہے۔ کسی ایک عالم دین پر دوسرے عالم دین کی نقد کا یہ لازمی مطلب نہیں ہوتا کہ وہ عالم دین کوئی متنازع شخصیت بن گیا ہے۔ اگر کسی عالم دین پر کسی دوسرے عالم دین کی نقد ہونے کو اس کے متنازع ہونے کی دلیل بنا لیا جائے تو عالم اسلام میں چودہ صدیوں میں کوئی ایک بھی ایسا عالم دین نہ گزرا ہو گا جو متنازع نہ ہو یا جس کی آراء سے دوسرے اہل علم کو اختلاف نہ رہا ہو۔ ہم شیخ قرضاوی کی علمی، فقہی، دعوتی، تحریکی اور تدریسی خدمات کی قدر اور تحسین کرتے ہیں اور ان کی شاذ آراء میں مثبت علمی مکالمے اور مباحثے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں شیخ قرضاوی کو بعض فتاویٰ کے اجراء میں تساہل یا تشدد کی وجہ سے ان پر متجدد یا بنیاد پرست کا لیبل لگانا درست نہیں ہے، بلکہ وہ ہر مسئلے میں اعتدال کی تلاش کے خواہش مند رہتے ہیں۔ اب یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے کہ کسی مسئلے میں وہ اعتدال پر قائم رہتے ہیں یا نہیں۔

فتاویٰ کے اجراء میں قرضاوی آسان رائے کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنے اس منہج کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ اگر تو یہ منہج نصوص کی حد تک ہو یعنی نصوص سے ثابت شدہ مختلف

آراء میں آسان رائے کے مطابق فتویٰ جاری کر دیا جائے تو یہ شرعی مطلوب و مقصود ہے، جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ سے صحیح روایت میں یہ بات ثابت ہے کہ جب آپ کو دو چیزوں میں اختیار دیا جاتا، تو آپ آسان کو اختیار کرتے تھے جبکہ دونوں چیزیں جائز ہوتی تھیں۔ اور اگر یہ آسانی فقہاء کی مختلف آراء میں تلاش کی جائے تو مذموم ہے، یعنی کسی بھی شخص کے لیے یہ درست نہیں کہ فقہاء کی مختلف آراء میں سے آسان رائے کو صرف اس کے آسان ہونے کی وجہ سے اختیار کر لے سوائے اس کے کہ کوئی عالم دین ان مختلف فقہی آراء کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے قرآن و سنت کے دلائل کی بنیاد پر کسی رائے کو ترجیح دے اور وہ آسان رائے ہو تو یہ عمل جائز ہے۔ اگر یہ عمل کسی ایک ہی فقہ میں مروی مختلف آراء میں ترجیح دینے کی صورت میں ہو تو فقہائے حنفیہ اسے "اجتہاد في المذھب" کا نام دیتے ہیں اور اگر ایک سے زائد مذاہب کی آراء میں ہو تو اسے "اجتہاد في المذاھب الإسلامیة" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ شیخ یوسف قرضاوی اسے اجتہاد انتقائی کا نام دیتے ہیں۔ شیخ قرضاوی کے بعض فتاویٰ میں یہ بات بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ وہ نصوص کے علاوہ بعض اوقات فقہاء کے مختلف اقوال میں بھی سہولت کے پہلو کو ترجیح دینا شروع کر دیتے ہیں اور اس ترجیح کی بنیاد کسی نص یا شرعی دلیل پر نہیں رکھتے ہیں۔ شیخ قرضاوی کا یہ منہج درست نہیں ہے اگرچہ ایسا انہوں نے چند ایک مقامات پر ہی کیا ہے۔ اجنبی عورت کے ساتھ مصافحہ، موسیقی کا جواز، خواتین کے ستر و حجاب اور مرد و زن کے اختلاط کے بارے میں شیخ قرضاوی کی آراء درست نہیں ہیں، ان میں نکتہ رسی تو ہے لیکن نصوص کا احصاء نہیں ہے۔ شیخ قرضاوی نے بہت سی نصوص کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ فتاوی جاری کیے ہیں۔ فتاویٰ کے اجراء میں شیخ قرضاوی میں یہ بھی ایک کمی بتلائی جا سکتی ہے کہ ان میں فقاہت اور نکتہ رسی تو خوب ہے لیکن سعودی علماء کی طرح نصوص کا احصاء نہیں کرتے اور بعض اوقات اپنے فتویٰ کی بنیاد بہت سی نصوص کو نظر انداز کرتے ہوئے چند ایک نصوص پر رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی

پیدائش اور ابتدائی تعلیم:

دمشق کے نواحی علاقہ میں ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے اور ابھی تک حیات ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر ہی سے حاصل کی اور سکینڈری تعلیم دمشق یونیورسٹی کے کلیہ شریعہ سے حاصل کی۔ بعد ازاں جامعہ ازہر کے کلیہ شریعہ سے ۱۹۵۶ء میں بی۔اے کیا۔ ۱۹۵۹ء میں جامعہ قاہرہ کی فیکلٹی آف لاء سے شریعہ انسٹی ٹیوٹ کے تحت ڈپلومہ (ایم۔اے کے برابر ڈگری) کیا۔ ۱۹۶۳ء میں ''آثار الحرب في الفقه الإسلامي: دراسة مقارنة'' کے عنوان سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۳ء میں دمشق یونیورسٹی میں تدریس کا آغاز کیا اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ بن غازی یونیورسٹی، لیبیا اور متحدہ عرب امارات یونیورسٹی کی فیکلٹی آف لاء میں بھی پڑھاتے رہے۔ علاوہ ازیں خرطوم یونیورسٹی میں بھی تدریس کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ دمشق یونیورسٹی میں فقہ اسلامی اور اصول فقہ کے شعبہ کے چیئر مین بھی ہیں۔

شیخ نے اپنی کتاب ''الفقه الإسلامي وأدلته'' کے آخر میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا میرے بارے گمان یہ ہے کہ میں حنفی المسلک ہوں تو یہ گمان درست نہیں ہے بلکہ میں شافعی المسلک ہوں۔ بہر حال شافعی المسلک ہونے کے باوجود شیخ اپنے مذہب کی حمایت میں متعصب نہیں ہیں۔ اسی طرح عقیدے میں شیخ اشعریت کی طرف مائل ہیں۔ شیخ شادی شدہ ہیں اور ان کے پانچ بچے ہیں۔

عالمی اسلامی اداروں کی سربراہی اور رکنیت:

اردن میں ''المجمع الملكي لبحوث الحضارة الإسلامية'' کے ممبر ہیں۔ اسی طرح اجتہاد کے عالمی فقہی اداروں میں سے ''مجمع الفقه الإسلامي'' جدہ اور ''المجمع الفقهي الإسلامي'' مکہ مکرمہ کے رکن ہیں۔ علاوہ ازیں اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا کے رکن اور فقہاء شریعت اسلام اسمبلی، امریکہ کے نائب صدر اور اسلامی فقہ اکیڈمی، سوڈان کے بھی رکن ہیں۔ بحرین میں اسلامی اقتصاد کی کمپنی ''شركة المضاربة

والمقاصة الإسلامية" کی شریعہ ایڈوائزنگ کمیٹی کے صدر رہیں۔ شام میں فتویٰ کی اعلیٰ کمیٹی "مجلس الإفتاء الأعلى " کے رکن ہیں۔ وزارت اوقاف، شام کے تحت تحقیقی کمیٹی "لجنة البحوث والشؤون الإسلامية" کے بھی رکن ہیں۔ اسلامی اقتصاد میں تحقیقی ادارے "لجنة الدراسات الشرعية للمؤسسات المالية والإسلامية" کے بھی صدر رہیں۔

تالیفات وتصنیفات:

شیخ ۵۰۰ کے قریب مختلف کتب، رسائل اور تحقیقی مقالہ جات کے مصنف ہیں۔ جن میں سے ان کی کئی ایک کتب کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ تقابلی فقہ پر ان کی کتاب "الفقه الإسلامي وأدلته" کو ایک بنیادی مصدر کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور پاکستان اور سوڈان کی کئی ایک یونیورسٹیوں میں اس کتاب کے کچھ حصوں کو بطور نصاب بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک معنی میں فقہی انسائیکلوپیڈیا ہے اور ۱۱ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تقریباً ۲۲ مرتبہ شائع ہو چکی ہے جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور کئی ایک زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ کوئی بھی اسلامی لائبریری اس کتاب کے بغیر نامکمل ہے۔ تقابلی فقہ پر ویسے تو اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن یہ کتاب اپنے اسلوب بیان، ترتیب، زبان کی آسانی، جدید معاصر مسائل کے بیان، اقوال کی ترجیح میں عدم تعصب اور بنیادی مصادر سے رجوع کی وجہ سے کئی ایک منفرد خصوصیات کی حامل ہے۔ اسی طرح شیخ کی معروف کتابوں میں "التفسير المنير" ہے جو ۱۶ جلدوں میں ہے اور تقریباً ۷ مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ ان کی تیسری معروف کتاب "اصول الفقه الإسلامي" ہے جو تقابلی اصول فقہ کی کتابوں میں سے ایک بہترین کتاب ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور تقریباً ۱۲ مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ سعودی عرب کی کئی ایک اسلامی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی مقرر ہے۔

شیخ کی دیگر معروف کتب میں ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ آثار الحرب في الفقه الإسلامي، أصول الفقه الإسلامي، الفقه الإسلامي وأدلته، الوصايا

والوقف فی الفقه الإسلامی، التمویل وسوق الأوراق المالیة،خطابات الضمان، بیع الأسهم، بیع التقسیط، الأسس والمصادر الاجتهادیة المشترکة بین السنة والشیعة، أسباب اختلاف وجهات النظر، الاجتهاد الفقهی الحدیث منطلقاته واتجاهاته، أحکام التعامل مع المصارف الإسلامیة، الذرائع فی السیاسة الشرعیة والفقه الإسلامی، العرف والعادة، المذهب الشافعی ومذهبه الوسیط بین المذاهب الإسلامیة، مناهج الاجتهاد فی المذاهب المختلفة، تجدید الفقه الإسلامی، الفقه المالکی الیسر، تغیر الاجتهاد، تطبیق الشریعة الإسلامیة، العلاقات الدولیة فی الإسلام، الرخص الشرعیة، اصول التقریب بین المذاهب الإسلامیة، اجتهاد التابعین، الباعث علی العقود فی الفقه الإسلامی وأصوله،عقد التأمین، التفسیر المنیر فی العقیدة والشریعة والمنهج، القراءات المتواترة وأثرها فی الرسم القرآنی والأحکام الشرعیة، اصول مقارنة أدیان، البدع المنکرة، الإیمان بالقضاء والقدر، السنة النبویة، حقیقتها ومکانتها عند المسلمین، فقه السنة النبویة، الخصائص الکبری لحقوق الإنسان فی الإسلام ودعائم الدیمقراطیة الإسلامیة، الدعوة الإسلامیة وغیر المسلمین، المهج والوسیلة والهدف، الإسلام وتحدیات العصر، المحرمات وآثارها السئیة علی المجتمع، الدعوة علی منهاج النبوة، الأسرة المسلمة فی العالم العصر، الثقافة والفکر، القیم الإسلامیة والقیم الاقتصادیة اور تعدد الزوجات: المبدأ والنظریة والتطبیق وغیرہ ہیں۔

فتاوی و آراء:

شیخ سے جب سودی بینکوں میں نوکری کے بارے سوال ہوا تو انہوں نے کہا کہ عام حالات میں یہ نوکری حرام ہے۔البتہ! خصوصی حالات میں کہ جن میں کوئی شخص مضطر ہو اور اس کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہ ہو رہی ہوں تو اس صورت میں وہ اس شرط پر

نوکری کر سکتا ہے کہ دوسری جاب تلاش کرتا رہے اور ملتے ہی بینک کی جاب چھوڑ دے۔ شیخ سے جب کسی متعین مذہب کی تقلید کے بارے سوال ہوا تو انہوں نے کہا کہ امر واقعہ یہ ہے کہ ایک عامی کا مذہب وہی ہوتا ہے جو اس کے حاضر مفتی کا ہوتا ہے۔ پس عادت اور مصلحت کے پہلو سے تو عوام کے لیے اپنے مفتیان کرام کی تقلید لازم ہے لیکن شرعاً کسی متعین مذہب کی اتباع لازم نہیں ہے۔

اپنی کتاب "الفقه الإسلامی وأدلته" کے مقدمہ میں تلفیق بین المذاہب یعنی مختلف فقہی مذاہب میں بعض مسائل میں ایک مذہب اور بعض دوسرے مسائل میں دوسرے مذہب کی پیروی کرنے کے بارے انہوں نے کہا کہ اگر تو یہ تلفیق حاجت اور ضرورت کے تحت ہو تو مالکیہ اور بعض حنفیہ کے نزدیک جائز ہے اور شیخ بھی اسے جائز سمجھتے ہیں اور اگر یہ تلفیق رخصتوں کے حصول کے لیے ہو تو شیخ کے نزدیک مذموم ہے۔

اپنی کتاب "الفقه الإسلامی وأدلته" کے مقدمہ میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اہل تشیع اور اہل سنت کا اصل اختلاف عقیدے اور فقہ کا اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ حکومت اور سیاست کا اختلاف ہے۔ شیخ کا یہ بھی دعوی ہے کہ اہل تشیع اور اہل سنت میں مشہور مسائل میں صرف ۱۷ مقامات میں اختلاف ہے۔

اگر تو شیخ کی اس سے مراد متقدمین اہل تشیع اور اہل سنت کے مابین فرق ہے تو واقعتاً اُس اختلاف کی نوعیت مذہبی کی نسبت سیاسی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر محدثین نے بھی اپنے دور کے شیعہ راویوں سے روایات لی ہیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اہل تشیع کے ہاں بلاشبہ سینکڑوں توہمات و خرافات کو عقائد اور بدعات و رسومات کو مذہب کے نام پر جاری کیا گیا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے معروف ایرانی شیعہ عالم اور مجتہد ڈاکٹر موسی الموسوی کی کتاب "اصلاح شیعہ" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ لہذا اب جو شیعہ مذہب موجود ہے، اس میں اور اہل سنت والجماعت میں بنیادی عقائد کا بھی اختلاف ہے اور فقہ میں بھی بنیادی سینکڑوں

اختلافات موجود ہیں۔

شیخ نے اپنی کتاب "الفقه الإسلامی وأدلته" میں عورت کے تمام بدن یہاں تک کہ اس کے چہرے اور ہاتھوں کو غیر محرم مردوں کے لیے ستر قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک عورت کے لیے غیر محرم مردوں سے ان اعضاء کا چھپانا لازم ہے۔ شیخ نے اپنی اسی کتاب میں سودی بینکوں کے منافع کو سود ہی قرار دیتے ہوئے حرام، حرام اور حرام قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے غیر سودی یعنی اسلامی بینکوں کے منافع اور ان کے ساتھ تعامل کو جائز قرار دیا ہے۔

شیخ نے اپنے ایک فتوی میں نکاح مسیار کو جائز قرار دیا ہے جبکہ اس میں ایجاب وقبول، ولی، گواہان اور اعلان نکاح موجود ہو۔ نکاح مسیار یہ ہے کہ ایک مرد و عورت باہمی رضامندی سے اس شرط پر نکاح کر لیتے ہیں کہ عورت اپنے نان نفقہ اور مکان کے حق سے دستبردار ہو جاتی ہے یعنی عورت اپنے شوہر سے نان نفقہ یا مکان طلب نہیں کر سکتی اور اس کی ذمہ داری خود اٹھاتی ہے یا عورت کے والدین اٹھاتے ہیں۔ بعض حنبلی اور شافعی علماء اس کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس نکاح میں اگر ولی، گواہان، ایجاب وقبول اور اعلان نکاح موجود ہو تو نکاح کے ارکان اور شرائط پوری ہیں لہٰذا ان کے ہاں یہ نکاح جائز ہے۔ اس کے برعکس علماء کی ایک جماعت نکاح کی اس قسم کو عورت پر ظلم قرار دیتی ہے اور اسے شرعاً ناجائز کہتی ہے۔ علماء کی ایک تیسری جماعت مطلقاً تو اس قسم کے نکاح کی اجازت نہیں دیتی اور نہ ہی اس کو رائج کرنے کے حق میں ہے لیکن یہ علماء ضرورت اور حاجت کے تحت نکاح کی اس قسم کو جائز قرار دیتے ہیں مثلاً کسی عورت کی شادی کی عمر گزر چکی ہے اور شادی کا امکان نہیں ہے یا کوئی خاتون بیوہ ہیں اور انہیں حفاظت کے پہلو سے کسی مرد کے سہارے کی ضرورت ہے یا کسی نوجوان کے زنا میں پڑنے کا اندیشہ ہے لیکن وہ نکاح کی مالی استطاعت بھی نہیں رکھتا ہے وغیرہ۔ ہمارے پاکستانی معاشرے میں نکاح کے موقع پر گھر جوائی بنانے کی شرط لگانا نکاح مسیار ہی کی ایک قسم ہے۔

ڈاڑھی کے بارے شیخ کا موقف یہ ہے کہ ڈاڑھی کا منڈوانا حنابلہ، مالکیہ اور حنفیہ کے نزدیک حرام ہے جبکہ شافعیہ کے مکروہ تنزیہی ہے۔ شافعی ہونے کی وجہ سے ڈاڑھی کے بارے وہ شافعی مسلک ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ڈاڑھی کتروانے کے بارے ان کا موقف یہ ہے کہ وہ ایک مشت سے بھی کم کروانے کے قائل ہیں اور صرف حلق کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔

خلاصہ کلام:

شیخ کی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ کو علوم اسلامیہ میں بہت رسوخ حاصل ہے۔ شیخ کی بعض آراء یا افکار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ان پر نقد بھی ممکن ہے لیکن ان پر تجدد کا الزام لگانا درست نہیں ہے۔ بعض فقہی مسائل میں بعض اہل علم کے نزدیک ان کی آراء شاذ ہو سکتی ہیں لیکن ان آراء کے اظہار میں بھی وہ سلف صالحین اور مذاہب اسلامیہ کی فروعات سے کوئی رشتہ جوڑتے ہی نظر آتے ہیں اور متجددین کی طرح فقہ اسلامی کے تاریخی ذخیرے سے صرف نظر کرتے ہوئے اسلام کی تعبیر نو یا تشکیل جدید کرنا ان کا منہج نہیں ہے اور اس کی سب سے بڑی دلیل ان کی کتاب ''الفقه الإسلامی وأدلته'' ہے۔

باب سوم

ترکی میں جدیدیت کی تحریک

مصطفی کمال پاشا

پیدائش اور نسب نامہ:

مصطفی کمال کا اصلی نام ''مصطفی'' تھا اور بعض روایات کے مطابق انہیں نوعمری میں ہی ان کے ریاضی کے استاذ نے ریاضی میں ان کی مہارت کے سبب ''کمال'' کا لقب عطا کیا تھا، جس سے وہ ''مصطفی'' سے ''مصطفی کمال'' بن گئے، جبکہ بعض تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ مصطفی نے اپنے لیے ''کمال'' کا لقب معروف ترکی شاعر ''نامق کمال'' سے متاثر ہو کر اختیار کیا تھا۔

''پاشا'' کا لفظ ترکی زبان میں ملٹری یا سول آفیسر مثلاً جنرل یا گورنر کے عہدے کے لیے بولا جاتا ہے۔ مصطفی کمال کو ''پاشا'' کا لقب ان کے ملٹری عہدے یا جنرل کے عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے دیا گیا، جیسا کہ پاکستان میں پرویز مشرف کو عموماً جنرل پرویز مشرف کہہ دیا جاتا تھا۔ مصطفی کمال پاشا کو ''اتاترک'' کا لقب بھی دیا گیا ہے جس کا معنی ''بابائے ترک'' ہے۔

مصطفی کمال کی ولادت ۱۸۸۱ء میں سلطنت عثمانیہ کے ایک علاقہ ''سلونیکا'' میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام علی رضا افندی اور والدہ کا نام زبیدہ ہانم تھا۔ شیخ عبد اللہ عزام کے بقول ایک روایت یہ بھی ہے کہ مصطفی کمال کا نسب نامہ محفوظ نہیں ہے، یعنی اس کی ماں کا نام تو زبیدہ ہانم ہے لیکن اس کے باپ یا دادا کا علم نہیں ہے کہ وہ کون تھا؟ مصطفی کمال کے قریبی دوست فالح رفقی نے یہ بات نقل کی ہے کہ میں نے ایک دن مصطفی کمال کو یہ بات کہتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ وہ علی رضا افندی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہ میرا باپ نہیں ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق مصطفی کمال اتاترک کا باپ حسین آغا نامی شخص تھا جو اپنی قومیت کے اعتبار سے ترک کی بجائے بلغارین یا سربین یا رومانی تھا۔ فتحی بشیر بلعاوی نے اپنے مقالہ "الرجل الصنم" میں مصطفی کمال کے نسب نامہ کو مشکوک قرار دیا ہے۔

ابتدائی تعلیم اور گریجویشن:

مصطفی کمال کو ان کی والدہ نے ابتدائی تعلیم کے لیے محلہ کے ایک مدرسہ میں داخل کروایا لیکن ان کا دل مذہبی تعلیم میں نہ لگ سکا اور اپنے والد کی خواہش پر انہوں نے سلونیکا ہی میں ماڈرن نصاب کے حامل ایک سکول ''شمسی افندی مکتبی'' میں داخلہ لیا۔ مصطفی کمال کے والد علی رضا افندی ایک سرکاری ملازم تھے اور بعد ازاں انہوں نے ملازمت کو خیر آباد کہہ کر کاروبار شروع کیا۔ مصطفی کمال کے والدین اس سے کاروبار کروانا چاہتے تھے لیکن مصطفی کمال نے اپنے والدین کی خواہش کے برعکس انہیں بتائے بغیر ۱۸۹۳ء میں ایک جونیئر ملٹری ہائی سکول میں داخلے کا امتحان دیا۔ ۱۸۹۶ء میں ان کا ملٹری ہائی سکول میں داخلہ ہوا۔ ملٹری ہائی سکول سے فراغت کے بعد انہوں نے ۱۸۹۹ء میں ''وار کالج'، میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۲ء میں اپنی گریجویشن مکمل کی۔ بعد ازاں انہوں نے ۱۹۰۵ء میں 'ملٹری سٹاف کالج' سے بھی گریجویشن مکمل کی۔

ملازمت اور کیریئر:

گریجویشن کے بعد مصطفی کمال دمشق میں موجود سلطنت عثمانیہ کی فوج میں بطور ''سٹاف کیپٹن'' بھرتی ہوئے۔ یہاں انہوں نے ایک انقلابی جماعت ''وطن وحریت'' میں بھی شمولیت اختیار کی جو سیاسی اصلاحات کی دعویدار تھی۔ اسی جماعت سے مصطفی کمال نے خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے ایک عسکری انقلاب لانے کی فکر پھیلانے کی ابتدا کی، باوجودیکہ وہ خود خلافت عثمانیہ کا ایک تنخواہ دار فوجی افسر تھا۔ ۱۹۲۰ء میں انہیں سینیئر کیپٹن کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اسی دوران مصطفی کمال نے اپنی سینیئر لیڈر شپ پر تنقید کرنا شروع کر دی جس کی وجہ سے ۱۹۰۸ء میں انہیں ریلوے میں انسپکٹر کی ذمہ داری پر تعینات کر دیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں انہیں دوبارہ البانیا میں بطور لیفٹیننٹ تعینات کیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں وزارت جنگ میں ان کو ایک ذمہ داری سونپی گئی اور ۱۹۱۲ء میں انہیں لیبیا میں جاری جنگ میں بھیج دیا گیا۔ یہ جنگ اٹلی اور ترکی کے مابین جاری تھی۔ ۱۹۱۳ء میں ان کا صوفیا میں ملٹری اتاشی کے طور پر تقرر کیا گیا اور ۱۹۱۴ء میں

لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ ۱۹۱۷ء میں انہیں سیکنڈ آرمی کے لیے کور کمانڈر کے طور پر منتخب کیا گیا۔ انہوں نے ۸ جولائی ۱۹۱۹ء کو سلطنت عثمانیہ کی فوج سے استعفاد یااور سلطنت نے ان کی گرفتاری کے احکامات جاری کیے۔

۲۳/اپریل ۱۹۲۰ء کو مصطفی کمال نے ''گرینڈ نیشنل اسمبلی'' کی بنیاد رکھی۔ ۵ اگست ۱۹۲۱ء کو گرینڈ نیشنل اسمبلی کی طرف سے مصطفی کمال کو ''کمانڈر ان چیف'' کا عہدہ دیا گیا اور اس عہدے کے تحت مصطفی کمال نے یونانیوں سے جنگ کر کے ان سے ترکی کے مقبوضہ علاقے بازیاب کروالیے۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو 'خلافت'' کے ادارے کا خاتمہ کر دیا گیااور اس کی پاورز ''گرینڈ نیشنل اسمبلی'' کو منتقل کر دی گئیں۔ مصطفی کمال اتاترک نے اپنے تئیں خلافت عثمانیہ کو ''جمہوریہ ترکیہ'' میں تبدیل کر دیا، لیکن یہ جمہوریت ایسی ہی تھی کہ خود مصطفی کمال اتاترک لگاتار چار دفعہ اس جمہوریہ ترکیہ کے صدر منتخب ہوتے رہے اور تادم وفات جمہوریہ کے صدر رہے۔

جنگی خدمات:

۱۹۱۳ء میں ''جالیپولی'' کی جنگ میں بلغاریہ کو شکست دی۔ ۱۹۱۵ء میں ''دردنیل'' کی جنگ میں کرنل کی حیثیت سے انگلینڈ کو بدترین شکست سے دوچار کیا اور اس کے اعزاز میں انہیں جنرل کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں ''قفقاس'' کی جنگ میں روس سے سلطنت عثمانیہ کے کئی ایک شہر آزاد کروائے۔ ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء کو بحیرہ اسود کے کنارے ''جنگ آزادی'' کے لیے پڑاؤ ڈالا۔ اس جنگ کا مقصد عثمانی خلفاء و سلاطین سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں ''ازمیر'' کی جنگ میں یونانیوں کو شکست دی اور سلطنت عثمانیہ کے کئی ایک علاقے واپس لیے۔ اس کے بعد ۲۳/اپریل ۱۹۲۰ء کو ''گرینڈ نیشنل اسمبلی'' کا اجلاس بلوایااور انہیں اس اسمبلی کا صدر مان لیا گیا اور ''کمانڈر ان چیف'' کا عہدہ دے دیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں مصطفی کمال اتاترک نے برطانوی اور فرانسیسی افواج کو ترکی کی سرزمین سے مار بھگایا جس کی وجہ سے انہیں عوام الناس میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، یہاں تک کے مشہور مصری شاعر احمد شوقی نے ان کی تعریف میں ایک

قصیدہ لکھا۔ لیکن بعد میں جب مصطفی کمال اتاترک کے ''کمالات'' کا ظہور ہونا شروع ہوا اور انہوں نے خلافت اسلامیہ کے ادارے کو ختم کر دیا تو احمد شوقی نے اس کی مذمت کرتے ہوئے اپنے ان اشعار سے رجوع کر لیا اور یہ اشعار کہے:

الهند والهة، ومصر حزنية

تبكي عليك بمدمع سحاح

والشام تسأل والعراق وفارس

أمحا من الأرض الخلافة ماح

''ہندوستان حواس باختہ ہے اور مصر غمگیں ہے اور یہ دونوں تجھ پر بہت زیادہ آنسو بہانے والی آنکھ سے رو رہے ہیں۔ شام سوال کر رہا ہے اور عراق اور فارس بھی پوچھ رہے ہیں۔ کیا اس زمین سے خلافت کو مٹا دیا ہے ایک مٹانے والے نے؟''

دینی افکار و نظریات:

مصطفی کمال اتاترک نے ۱۹۲۳ء میں ترکی کی پارلیمنٹ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اب ہم بیسویں صدی میں ہیں اور ہمیں ایسی کتاب کی اتباع کی ضرورت نہیں ہے جس کے موضوعات ''تین و زیتون'' ہیں۔ مستشرق آر مسٹرانگ نے لکھا ہے کہ مصطفی کمال نے دوستوں میں کئی دفعہ یہ بات کی کہ وہ ترکی سے دین اسلام کی بنیادیں تک اکھیڑ دینا چاہتا ہے۔

استاذ انور الجندی کے بقول مصطفی کمال نہ تو مجاہد تھا اور نہ ہی مصلح تھا، بلکہ وہ اتحادی افواج کا تتمہ تھا۔ استاذ انور الجندی نے مصطفی کمال اتاترک کو ایک صیہونی یہودی ایجنٹ قرار دیا ہے۔ فتحی بشیر البلعاوی نے مصطفی کمال کو ''یہود الدونمہ'' میں سے ایک قرار دیا ہے اور اس کے ثبوت کے لیے کئی ایک حقائق پیش کیے ہیں۔ ''یہود الدونمہ'' سے مراد یہود کا وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہو لیکن حقیقت میں یہودی ہو اور اپنے اسلام کے اظہار سے اس کا اصل مقصود دین اسلام کو نقصان پہنچانا ہو۔ ''الدونمہ'' کا

لقب عثمانیوں نے سترہویں صدی میں ان یہود کو دیا تھا جو خلافت عثمانیہ کے علاقے ''سلونیکا'' میں تھے اور اپنے اسلام کا اظہار کرتے تھے۔ مصطفی کمال کی پیدائش بھی اسی علاقے میں ہوئی تھی۔ ''atajew'' نامی ویب سائیٹ پر مصطفی کمال کے یہودی ہونے کے بارے کچھ شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

فتحی بشیر بلعاوی نے اپنے مقالہ میں مصطفی کمال پر یہ بھی الزام عائد کیا ہے کہ اس کی زندگی کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین چیزوں میں غرق تھا: عورت، شراب اور بڑا بننے کا جنون۔ فتحی بشیر بلعاوی نے اس کی شراب نوشی اور عورتوں سے تعلقات پر مفصل گفتگو کی ہے۔

دشمن دین قوانین کا نفاذ:

یکم مارچ ۱۹۲۶ء کو ترکی میں ''ترکش پینل کوڈ'' کو ضابطہ فوجداری کے طور پر نافذ کیا گیا جو ''اٹالین قانون'' سے ماخوذ تھا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو اسلامی عدالتیں بند کر دی گئیں۔ اسی تاریخ میں ترکی کا دیوانی قانون بھی نافذ کیا گیا جو سوئٹزر لینڈ کے دیوانی قانون سے ماخوذ تھا۔ اس قانون کے مطابق عورتوں کا وراثت میں مردوں کے برابر حصہ تسلیم کیا گیا اور انہیں اپنے شوہروں کو طلاق دینے کا حق بھی دیا گیا۔ طلاق کے لیے یہ بھی ضابطہ مقرر ہوا کہ وہ عدالت میں ہی دی جائے گی۔ ۱۹۲۵ء میں ایک قانون کے ذریعے انگریزی ہیٹ کو رواج دیا گیا اور سرکاری ملازمین کے لیے اسے لازم قرار دیا گیا۔

۱۹۲۸ء میں ترکی کے دستور سے یہ بات نکال دی گئی کہ ترکی ایک اسلامی مملکت ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ایک قانون کے ذریعے ترکی زبان میں لکھی گئی کتابوں کی عربی حروفِ ہجاء میں نشر واشاعت ممنوع قرار پائی اور ترکی زبان کی کتابت کے لیے لاطینی حروف کو لازم قرار دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں ایک قانون کے ذریعے عورتوں کو مردوں کے برابر سیاسی حقوق عطا کیے گئے اور ۱۹۳۵ء کے عمومی انتخابات میں ۱۸ خواتین کو پارلیمنٹ ممبر کے طور پر منتخب کیا گیا۔ جرمنی کے قوانین سے ماخوذ ''قانونِ تجارت'' کا نفاذ کیا گیا۔

۱۹۲۴ء میں وزارتِ اوقاف کو ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں وزارت اوقاف کے تحت

مساجد کو بند کر دیا گیا۔ ۱۹۳۱ء اور ۳۲ء میں مساجد کی تعداد کو محدود کر دیا گیا۔ ۳۰۰ کے قریب سرکاری خطیب تیار کیے گئے تاکہ وہ جمعہ کے خطبات میں زراعت، کاریگری اور ریاستی سیاست کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کریں۔ استنبول شہر کی دو بڑی مساجد اور مدارس میں سے ایک مسجد ''آیا صوفیا'' کو میوزیم بنا دیا گیا جبکہ دوسری بڑی مسجد ''مسجد الفاتح'' کو سرکاری گودام بنا لیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں جمعہ کی چھٹی کی بجائے اتوار کی چھٹی کا اعلان کیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں استنبول یونیورسٹی میں شریعہ کالج کو مستقل طور پر بند کر دیا گیا۔ تمام کالجز سے عربی اور فارسی زبان میں تعلیم ختم کر دی گئی۔ اسلامی عیدوں عید الفطر اور عید الاضحی کو لغو قرار دیا گیا۔

مصطفی کمال کے حکم پر عربی میں اذان پر پابندی عائد کی گئی اور ترکی زبان میں اذان کو رائج کیا گیا۔ پہلی کلاس سے لے کر یونیورسٹی تک مخلوط تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا اور عوامی مقامات پر عورتوں کے حجاب اور دوپٹے پر قانونی پابندی عائد کر دی گئی۔ امریکہ سے ماہرین تعلیم بلوا کر ایک نصابِ تعلیم مقرر کیا گیا اور اسے تمام قدیم و جدید مدارس اور اسکولز کے لیے لازم قرار دیا گیا۔ شکیب ارسلان کا کہنا ہے کہ مصطفی کمال کی حکومت فرانسیسی اور انگلینڈ کی طرز کی سیکولر حکومت نہیں تھی بلکہ ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھی، کیونکہ فرانس اور انگلینڈ میں مذہب اور ریاست میں جدائی کے باوجود کبھی بھی ریاست کی طرف سے نہ تو انجیل کے رسم الخط میں مداخلت کی گئی اور نہ ہی چرچ کو لغو قرار دیا گیا، جبکہ مصطفی کمال کی حکومت مذہب اور دین اسلام کی دشمن حکومت تھی، جیسا کہ روس کی حکومت کا معاملہ ہے جس نے مذہب کو جڑ سے اکھیڑنے کی کوشش کی۔

روایتی صوفی ازم کو ختم کیا گیا اور صوفیاء کے سلاسل پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بعض خانقاہوں کو میوزیم میں تبدیل کیا گیا۔ مجسمہ سازی کو رواج دیا گیا اور ۱۹۲۷ء میں ''State Art and Sculpture Museum'' کی بنیاد رکھی گئی۔ روایتی مغربی میوزک ''اوپرا'' اور ''بیلیٹ'' کو رواج دیا گیا۔ تھیٹر کو بھی عام کیا گیا اور فلم انڈسٹری پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ہجری تقویم کی جگہ مسیحی تقویم جاری کی گئی۔ تعدد ازواج پر

پابندی لگائی گئی، وغیرہ۔ مصطفی کمال کے ان اقدامات کو بعد ازاں "کمال ازم" اور "اتاترک ازم" کا نام دیا گیا۔

وفات: جگر اور اعصاب کی تکلیف کی وجہ سے ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو وفات پائی۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق انہیں یہ تکالیف شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے لاحق تھیں۔ ترکی میں ہی انہیں "انقرہ" میں دفن کیا گیا۔ فتحی بلعاوی کے بقول مصطفی کمال نے اپنے مرنے سے پہلے یہ وصیت بھی کی تھی کہ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھائی جائے۔

خلاصہ کلام: مذکورہ بالا بحث کے نتیجے میں مصطفی کمال پاشا کے ڈکٹیٹر یا دشمن اسلام ہونے یا الحاد میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ تعجب تو اس پاکستانی ڈکٹیٹر پر ہوتا ہے جو مصطفی کمال پاشا کو اپنا آئیڈیل قرار دیتا تھا کہ معلوم نہیں وہ مصطفی کمال کی طرح پاکستان کے ساتھ کیا کرنا چاہتا تھا؟ مصطفی کمال پاشا جیسے لوگوں کے بارے میں تبصرہ کے لیے درج ذیل قرآنی آیات کی تلاوت ہی کو ہم کافی سمجھتے ہیں:

﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (85) كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (86) أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ [آل عمران: 85-87]

"اور جو کوئی دین اسلام کے علاوہ کوئی اور دین چاہے گا تو وہ (اللہ کے ہاں) ہرگز قبول نہ کیا جائے گا، اور ایسا شخص آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کیسے ہدایت دیں جنہوں نے ایمان لانے کے بعد اور یہ گواہی دینے کے بعد کہ رسول (ﷺ) حق ہیں، کفر کیا اور ان لوگوں کے پاس واضح نشانیاں بھی آ چکی تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیں گے۔ ایسے ظالموں کی جزا تو یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہو اور فرشتوں کی لعنت ہو اور تمام نوع انسانی کی لعنت ہو۔"

باب چہارم

ترکی میں جدیدیت کی تحریک

سر سید احمد خان

سید احمد خان کی پیدائش ۱۷/17 اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ سید احمد خان کے آباء واَجداد کے بارے میں معروف رائے تو یہ ہے کہ وہ افغانستان کے صوبہ ہرات سے آکر دہلی میں آباد ہوئے تھے، جبکہ ایک دوسری رائے کے مطابق وہ عرب سے یہاں آئے تھے۔ سید احمد خان کے آباء واَجداد سلطنتِ مغلیہ کے دربار میں مختلف انتظامی عہدوں پر فائز رہے ہیں، جیسا کہ ان کے نانا اکبر شاہ دوم کے وزیر تھے اور کچھ عرصہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سفیر بھی رہے۔ سر سید کے والد محترم میر محمد متقی بھی اکبر شاہ دوم کے مشیر خاص تھے۔ سر سید نے اردو، عربی، فارسی اور ابتدائی دینی تعلیم اپنے گھر اور شہر میں ہی حاصل کی۔ سر سید نے اپنے والد کے ساتھ بچپن ہی سے دربار جانا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۳۸ء میں ان کے والد کی وفات کے بعد انہیں بہادر شاہ ظفر دوم کی طرف سے ''عارف جنگ'' اور بعد ازاں ۱۹۴۲ء میں ''جواد الدولہ'' کا خطاب دیا گیا۔

والد کی وفات کے بعد سر سید نے بہادر شاہ ظفر کے دربار کو ملازمت کے لیے پسند نہ کیا اور سلطنت مغلیہ کے مسلسل زوال اور شکست وریخت کے پیش نظر انہوں نے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کو ترجیح دی۔ انہوں نے آگرہ میں ایک عدالت میں ''سر رشتہ دار'' یعنی کلرک کے طور پر ملازمت شروع کی اور بعد میں ۱۸۴۰ء میں ''منشی'' کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۸۵۸ء میں انہیں مراد آباد عدالت میں ایک اہم عہدے پر فائز کیا گیا جہاں سے انہوں نے اپنے تعلیمی کام کا آغاز کیا۔ ۱۸۶۹ء میں انہوں نے انگلینڈ کا سفر کیا اور ۱۸۷۶ء میں ملازمت ترک کر کے علی گڑھ میں مقیم ہو گئے۔

۱۸۷۸ء میں امپیریل کونسل کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے رکن بنے اور ۱۸۸۷ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن نامزد ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں انہیں کے سی ایس آئی کا خطاب ملا اور ۱۸۸۹ء میں انہیں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ''ایل ایل ڈی'' کی ڈگری دی۔ انہوں نے ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو وفات پائی۔ سید احمد خان کے تذکرہ نگاروں نے ان کی زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلا دور:

سید احمد خان کی زندگی کا پہلا دور پیدائش سے ۱۸۵۷ء تک کا ہے۔اس دور میں ان پر روایت پسندی غالب نظر آتی ہے، اگرچہ جدیدیت کے کچھ رجحانات اور میلانات بھی موجود ہیں۔اس عرصے میں سید احمد خان نے "جام جم" کے نام سے مغل بادشاہوں کی ایک مختصر تاریخ فارسی میں مرتب کی۔ اسی طرح مذہب، اخلاق اور تصوف پر کچھ رسائل تصنیف کیے۔ "راہ سنت وبدعت" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں تقلید کی مخالفت کی۔ اہل تشیع کے رد میں "تحفہ حسن" نامی کتابچہ مرتب کیا۔ روایتی پیری مریدی کے خلاف "کلمۃ الحق" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔امام غزالی رحمہ اللہ کی کتاب "کیمیائے سعادت" کے بعض ابواب کا ترجمہ کیا۔ان کتب میں سید احمد خان، امام غزالی، سید احمد بریلوی، شاہ عبد العزیز رحمہم اللہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔اس دور میں انہوں نے علم ریاضی میں بھی بعض رسائل لکھے۔

اس دور کے سید احمد خان کے علمی کارناموں میں "آثار الصنادید" نامی کتاب ہے جس میں انہوں نے دہلی کی قدیم عمارتوں کی تاریخ بیان کی ہے۔اس کتاب کا بعد میں فرانسیسی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔علاوہ ازیں ابو الفضل کی کتاب "آئین اکبری" کی تحقیق واشاعت بھی سید احمد خان کے اسی دور کے اہم کارناموں میں سے ہے۔سید احمد خان نے اس کتاب کی تقریظ مرزا اسد اللہ غالب سے لکھنے کو کہا جنہوں نے اس کتاب کے لیے ایک فارسی نظم لکھی جس میں سید احمد خان کو اشارتاً ماضی پر اپنا وقت ضائع نہ کرنے کی تلقین کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سر سید برطانوی گورنمنٹ کے وفادار رہے اور انہوں نے کئی ایک انگریزوں کی جانیں بھی بچائیں۔البتہ جنگ کے خاتمہ کے بعد انہوں نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" کے نام سے کتاب لکھی جس میں انگریز حکومت پر شدید نقد کی۔

دوسرا دور:

سید احمد خان کی زندگی کا دوسرا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک کا ہے۔اس دور میں سید

احمد خان کی زندگی میں مصلحت کی زندگی بسر کرنے اور انگریز حکمرانوں کے ساتھ اتحاد کے جذبات کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس دور کی اہم تصانیف میں ''اسباب بغاوتِ ہند'' ہے جس میں انہوں نے برطانوی انگریز حکومت پر شدید تنقید کی جو جنگ آزادی کو مسلمانوں کی طرف سے ایک طے شدہ سازش قرار دے رہے تھے۔ سید احمد خان نے اس کتاب میں یہ ثابت کیا کہ جنگ آزادی کا اصل سبب انگریز حکومت کا مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں عمل دخل تھا نہ کہ دوسری مسلمان حکومتوں کی طرف سے کوئی خارجی سازش۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین تعلقات کو خوشگوار کرنے کے لیے سر سید کی طرف سے ''مذہبی وحدت'' کا اصول متعارف کروایا گیا اور اس کے لیے ''تحقیق لفظ نصاریٰ'' اور ''رسالہ احکام بعام اہل کتاب'' کے نام سے رسائل لکھے گئے۔ انہوں نے ''تبیین الکلام'' کے نام سے بائیبل کی ایک تفسیر لکھنے کا بھی آغاز کیا تھا جو بوجوہ مکمل نہ ہو سکی۔ اس دور میں انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کا اخبار جاری کیا جو بعد ازاں ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے۔

تیسرا دور:

سید احمد خان کی زندگی کا تیسرا دور ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۸ء تک کا ہے۔ اس دور میں سید احمد خان کی ذات پر مغربی فکر و فلسفہ سے مرعوبیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ۱۸۶۹ء میں سید احمد خان نے انگریزوں کی تہذیب و تمدن کا مطالعہ کرنے کی غرض سے انگلینڈ کا سفر کیا۔ اس دور کے نمایاں کارناموں میں سے ان کی کتاب ''خطباتِ احمدیہ'' ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کا سبب معروف مستشرق سر ولیم میور کی سیرت پر کتاب ''لائف آف محمد'' تھی۔ اس مستشرق نے اپنی اس کتاب میں اللہ کے رسول ﷺ پر شدید طعن اور نقد کیا تھا۔ اس کا جواب دینے کے لیے سید احمد خان نے ''خطباتِ احمدیہ'' تصنیف کی۔ سید احمد خان نے انگلینڈ میں بیٹھ کر یہ کتاب اردو میں مرتب کی اور ایک اردو جاننے والے انگریز سے اس کا انگریزی ترجمہ کروایا۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی تالیف واشاعت میں سید احمد خان نے اپنا آبائی گھر اور اس کا سب ساز و سامان بھی بیچ دیا تھا۔ اس

کتاب میں سر سید نے مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی تمام جنگوں کو دفاعی جنگیں ثابت کیا۔

اسی دور میں سید احمد خان نے اپنی مشہور زمانہ تفسیر لکھنا شروع کی جس میں انہوں نے فطرت (Nature) کے بارے میں اپنا معروف فکر و فلسفہ پیش کیا۔ سید احمد خان نصف قرآن سے کچھ زائد یعنی تقریباً سترہ پارے مکمل کر پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ اس تفسیر میں انہوں نے امت مسلمہ کے اجماعی عقائد سے انحراف کرتے ہوئے آیاتِ قرآنیہ کی ایسی تاویلات کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس سے کتاب اللہ اہل مغرب کی عقل و سائنس کے مطابق قرار پائے۔ پس قرآنی آیات کو سائنسی اصول وضوابط کے مطابق بنانے کے لیے انہوں نے اس قدر تاویلات کیں کہ وہ اپنے مخالفین کے ہاں ''نیچری'' کے نام سے معروف ہو گئے اور ان کا فکر و فلسفہ ''نیچریت'' کے نام سے معروف ہوا۔ ان پر کفر کے فتوے بھی لگائے گئے۔ اس دور میں انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے ایک پرچہ کا اجراء بھی کیا اور اس میں شائع شدہ مضامین کو بعد ازاں اسی نام سے ایک کتاب میں مرتب کر کے علیحدہ بھی شائع کیا گیا ہے۔

اس دور میں ان کے مداحین کے ہاں ان کے کارہائے نمایاں میں ان کی علمی تحریک بھی ہے۔ لندن جانے سے سید احمد خان انگریزی طریقہ تعلیم اور طرز معاشرت سے شدید متاثر ہوئے تھے، چنانچہ انہوں نے واپس آکر ''التماس بخدمت اہل اسلام و حکام ہند در باب ترقی تعلیم مسلمانِ ہند'' کے نام سے ایک مضمون لکھ کر شائع کروایا۔ بعد ازاں انہوں نے ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیمِ مسلمانان'' قائم کی اور ایک انگریزی درسگاہ کا نقشہ تیار کیا۔ انہوں اس درسگاہ کے قیام کے لیے ایک دوسری کمیٹی ''خزینۃ البضاعۃ'' کے نام سے چندہ جمع کرنے کے لیے بنائی۔ بالآخر انہوں نے ۱۸۷۵ء میں ایک اسکول کی بنیاد رکھی اور دو سال بعد ۱۸۷۷ء میں یہ اسکول ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ کی بنیاد بنا۔ یہ کالج بعد میں ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر گیا تھا۔

علی گڑھ کالج مسلمانانِ ہند کے لیے محض انگریزی تعلیم کی درس گاہ ہی نہ تھی بلکہ

ایک سیاسی تحریک بھی تھی۔ اکبر الہ آبادی اور بعض دوسرے مسلمان رہنماؤں نے سید احمد خان کے اس طرزِ عمل اور انگریزی تہذیب و زبان کی گرویدگی پر شدید نقد کی۔ شروع میں سید احمد خان ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھی لیکن بعدازاں انہوں نے "انڈین نیشنل کانگریس" کے بالمقابل "پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" قائم کی۔ انہوں نے ہندی اور اردو زبان کے قضیہ میں اردو کی شدت سے حمایت کی اور ہمیشہ مسلمانانِ ہند کے لیے جداگانہ سیاسی حقوق کے داعی رہے۔

سید احمد خان کے رفقائے خاص میں مولانا شبلی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، الطاف حسین حالی اور مولوی نذیر احمد جیسی نامور شخصیات تھیں۔ سید احمد خان مسلمانوں میں ایک اہم سیاسی رسوخ کی حامل شخصیت تھے۔ سید احمد خان کا خیال تھا کہ ترقی یافتہ انگریز قوم سے غیر ترقی یافتہ مسلمانوں کا آزادی حاصل کرنا ایک ناممکن امر ہے، لہٰذا وہ مسلمانوں کو انگریز کی وفاداری، ان کی زبان و علوم سیکھنے اور ان کی تہذیب اختیار کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔

مذہبی تصورات:

سید احمد خان نے "تفسیر القرآن وهو الهدى والفرقان" کے نام سے قرآن مجید کے تقریباً سترہ پاروں کی تفسیر لکھی ہے۔ اس تفسیر کے شروع میں انہوں نے ۲۰ صفحات میں "تحریر فی اصول التفسیر" کے نام سے اپنے ۱۵ اصولِ تفسیر بھی نقل کیے ہیں جن میں سے بعض درست ہیں جبکہ بعض قطعی طور غلط ہیں۔ ان اصولوں کا خلاصہ ہم انہی کے الفاظ میں ذیل میں نقل کر رہے ہیں:

"۱۔ یہ بات مسلم ہے کہ ایک خدا خالق کائنات موجود ہے... ۲۔ یہ بھی مسلم ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء مبعوث کیے ہیں اور محمد ﷺ رسول برحق و خاتم المرسلین ہیں۔ ۳۔ یہ بھی مسلم ہے کہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے... ۴۔ یہ بھی مسلم ہے کہ قرآن مجید بلفظہ آنحضرت ﷺ کے قلب پر نازل ہوا ہے یا وحی کیا گیا ہے، خواہ یہ تسلیم کیا جاوے کہ جبریل فرشتہ نے

آنحضرت تک پہنچایا ہے جیسا کہ مذہب عام علمائے اسلام کا ہے یا ملکہ نبوت نے جو روح الامین سے تعبیر کیا گیا ہے آنحضرت کے قلب پر القا کیا ہے جیسا کہ میرا خاص مذہب ہے... مگر میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ صرف مضمون القا کیا گیا تھا اور الفاظِ قرآن آنحضرت ﷺ کے ہیں...۵۔قرآن مجید بالکل سچ ہے، کوئی بات اس میں غلط یا خلافِ واقع مندرج نہیں ہے...۶۔صفات ثبوتی اور سلبی ذات باری تعالیٰ کے، جس قدر قرآن مجید میں بیان ہوئے، سب سچ اور درست ہیں، مگر ان صفات کی ماہیت کا "من حیث ھی ھی" جاننا مافوقِ عقل انسانی ہے...۷۔صفاتِ باری تعالیٰ عین ذات ہیں اور وہ مثل ذات کے ازلی وابدی ہیں اور مقتضائے ذات، ظہورِ صفات ہے...۸۔تمام صفات باری تعالیٰ کی، نامحدود اور مطلق عن القیود ہیں...۹۔قرآن مجید میں کوئی امر ایسا نہیں ہے جو قانونِ فطرت (Nature) کے برخلاف ہو... بیشک ہمارے بعض اخوان کو اس پر غصہ آویگا اور قرآن مجید میں بعض امور کو معجزہ قرار دیکر اور ان کو مافوق الفطرت (Super Natural) سمجھ کر پیش کریں گے اور کہیں گے کہ قرآن مجید میں معجزات مافوق الفطرت موجود ہیں۔ہم ان کے اس قول کو نہایت ٹھنڈے دل سے سنیں گے اور عرض کریں گے کہ جو آیت قرآن مجید کی آپ پیش کرتے ہیں اور اس سے معجزات مافوق الفطرت پر استدلال فرماتے ہیں، آیا اس کے کوئی دوسرے معنی بھی ایسے ہیں جو موافق زبان وکلام عرب کے اور موافق محاورات اور استعمالات اور استعارات قرآن مجید کے ہو سکتے ہیں، اگر نہیں ہو سکتے تو ہم قبول کریں گے کہ ہمارا یہ اصول غلط ہے اور اگر ہو سکتے ہیں تو ہم نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ آپ اس بات کو ثابت نہیں کر سکے کہ قرآن مجید میں معجزات مافوق الفطرت موجود ہیں...۱۰۔قرآن مجید جس قدر نازل ہوا ہے، بتمامہ موجود ہے نہ اس میں ایک حرف کم ہوا ہے نہ زیادہ ہوا ہے...۱۱۔ہر ایک سورہ کی آیات کی ترتیب میرے نزدیک منصوص ہیں...۱۲۔قرآن مجید میں ناسخ ومنسوخ نہیں

ہے، یعنی اس کی کوئی آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوئی... ۱۳۔قرآن مجید دفعتہً واحدۃً نازل نہیں ہوا ہے بلکہ نجماً نجماً نازل ہوا ہے... ۱۴۔موجوداتِ عالم اور مصنوعات کائنات کی نسبت جو کچھ خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے، وہ سب "ھو ھو یا بحیثیة من الحیثیات"، مطابقِ واقع ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا قول اس کی مصنوعات کے مخالف ہو یا مصنوعات اس کے قول کے مخالف ہوں۔ بعض جگہ ہم نے قول کو "ورڈ آف گاڈ" (Word of God) اور اس کی مصنوعات کو "ورک آف گاڈ" (Work of God) سے تعبیر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ورڈ آف گاڈ اور ورک آف گاڈ دونوں کا متحد ہونا لازم ہے۔ اگر ورڈ، ورک کے کسی حیثیت سے مطابق نہیں ہے تو ایسا ورڈ، ورڈ آف گاڈ نہیں ہو سکتا۔ ۱۵۔باوجود اس بات کے تسلیم کرنے کے کہ قرآن مجید بلفظہ کلام خدا ہے مگر جب کہ وہ عربی میں اور انسان کی زبان میں نازل ہوا ہے تو اس کے معنی اسی طرح پر لگائے جاوینگے جیسے کہ ایک نہایت فصیح عربی زبان میں کلام کرنے کے معنی لگائے جاتے ہیں اور جس طرح کہ انسان استعارہ و مجاز و کنایہ و تشبیہ و تمثیل اور دلائل لمی واقناعی وخطابی واستقرائی والزامی کو کام میں لاتا ہے....الخ" (تفسیر قرآن: ۱/۱۔۱۴)

سر سید احمد خان کے اصول تفسیر میں سے سب سے زیادہ گمراہی کا سبب جو اصول بنا وہ ان کا نواں اصول ہے کہ جس کے مطابق قرآن مجید میں کوئی امر بھی خلافِ فطرت واقع نہیں ہوا ہے۔ اپنے اس اصولِ فطرت کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے اپنے آخری اصول کا سہارا لیا ہے اور اجماعی عقائد اسلامیہ کی تردید میں عربی لغت اور صرف ونحو کے ایسے ایسے نادر استعمالات واستشہادات سامنے لائے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اپنے اس اصول کے تحت انہوں نے قرآن مجید میں انبیاء ورسل کے معجزات کی عجیب وغریب تاویلات کیں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں عصائے موسیٰ سے سمندر کے پھٹنے اور سمندری پانی کے دیواروں کی مانند دونوں اطراف میں کھڑے ہونے کی تاویل سمندر کے مدو جزر سے کی۔ اسی طرح جب بنی اسرائیل میں ایک شخص کے

قتل ہونے پر گائے ذبح کر کے اسے گائے کا ایک ٹکڑا مارنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مردہ زندہ ہو گیا، جس کے بیان میں ارشادِ باری تعالیٰ ﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى﴾ کی تاویل سر سید نے یہ کی کہ مردہ کو زندہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ نامعلوم قاتل معلوم ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے بطور عذاب بندر بنائے جانے یعنی ﴿كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ کی تاویل بنی اسرائیل کے بندروں کی طرح ذلیل ورسوا ہونے سے کی ہے۔ حضرت عزیر علیہ السلام کے قصہ میں ﴿فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ﴾...الخ، کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد خواب ہے اور انہوں نے خواب میں اپنے مرے ہوئے گدھے کی ہڈیاں اٹھتے اور ایک گدھے کی صورت اختیار کرتے دیکھی تھیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ﴾ کی تاویل یہ کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں لیکن وہ صلیب پر نہیں مرے تھے بلکہ طبعی موت مرے تھے اور مسلمانوں نے رفع سماوی اور نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ نصاریٰ سے لیا ہے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پرندوں کی مورتیوں میں پھونک مار کر اڑتا ہوا پرندہ بنانے کے معجزات کا بھی انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن مجید میں یہ نہیں آیا کہ پرندے کی مورتی پھونک مارنے سے جاندار پرندہ بن جاتی تھی بلکہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ایک کھیل تھا جیسا کہ بچے مٹی کی مورتیاں بنا کر کھیلتے ہیں اور انہیں ہاتھوں میں اڑاتے پھرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مردوں کو زندہ کرنے کے معجزہ کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد ان کافروں کو اسلام میں داخل کرنا ہے۔ عصائے موسیٰ کے اژدھا بن جانے کی تاویل یہ کی کہ وہ دیکھنے والوں کے تخیل میں اژدھا اور سانپ تھا نہ کہ حقیقت میں کوئی سانپ بنا تھا، جیسا کہ جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں بھی حقیقت میں سانپ نہیں بنی تھیں۔ پس عصائے موسیٰ اور جادوگروں کی لاٹھیوں اور رسیوں دونوں کا معاملہ ایک ہی تھا۔ میدانِ بدر میں ایک ہزار فرشتوں کے نزول کی تاویل یہ کی کہ اس سے مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے دلوں کو میدانِ جنگ میں ایک ہزار گنا تقویت اور ثابت قدمی عطا فرمائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ پیدا ہونے کے معجزہ کا

انکار کیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کو ایک تخیل قرار دیا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا انکار کیا ہے اور اس کی تاویل یہ کی ہے کہ در حقیقت مچھلی نے ان کو منہ سے پکڑا تھا اور بعد میں چھوڑ دیا۔

قرآن مجید میں "ملائکہ" سے مراد "قوائے ملکوتی" لی ہے اور حضرت جبرائیل سے مراد "قدرۃ اللہ" یا "قوۃ اللہ" لی ہے۔ شیاطین سے مراد "شیاطین انس" یعنی انسان شیاطین لیے ہیں۔ جنات سے مراد "قوائے بہیمیہ" لیے ہیں یا وحشی واجڈ یاڈا کو لیے ہیں۔ انسانوں اور حیوانات کی "روح" کو ایک ہی روح یعنی "حیوانی روح" قرار دیا ہے۔ "سحر" یعنی جادو سے مراد ایک خاص قسم کی 'مقناطیسی قوت" لی ہے جس سے دوسروں کو ہپناٹائز کیا جاتا ہے۔ دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں سر سید احمد خان کا عقیدہ یہ ہے کہ روح جب انسان کے جسم سے نکل جاتی ہے تو اب اس دنیاوی جسم یا کسی نئے جسم کے ساتھ زندہ نہیں ہو گی بلکہ روح بذاتہ ایک جسم کی مالک ہے اور روح اپنے اس جسم کے ساتھ ہی اخروی زندگی گزارے گی۔ آسان الفاظ میں سر سید احمد خان آخرت میں صرف روحانی زندگی کے قائل ہیں نہ کہ جسمانی کے۔ جنت اور جہنم کی نعمتوں اور عذابوں کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ راحت و تکلیف کو بیان کرنے کے اسالیب ہیں اور جنت سے مراد کوئی مادی جنت نہیں ہے کہ جس میں حور و قصور ہوں بلکہ اس سے مراد روحانی راحت و سہولت ہے اور اسی طرح جہنم سے مراد بھی کوئی مادی جہنم نہیں ہے بلکہ اس سے مراد بے سکونی اور اضطراب کی کیفیات ہیں۔ واقعہ معراج کی یہ تاویل کی ہے کہ اس سے مراد خواب میں بیت المقدس اور آسمانوں کی سیر کرنا ہے۔ سورۃ المائدۃ میں ﴿الْمُنْخَنِقَةُ﴾ کی تفسیر میں اہل کتاب کے ان جانوروں کو حلال قرار دیا ہے جنہیں انہوں نے گلا گھونٹ کر مار دیا ہو، وغیرہ۔

خلاصۂ کلام:

اپنے افکار و نظریات کے اعتبار سے سر سید احمد خان بر صغیر پاک و ہند میں اعتزال جدید کے بانی تھے۔ اعتزالِ قدیم میں اس قدر تاویلات نہیں تھیں، کیونکہ وہاں مقصود یونانی

فلسفہ اور دینی عقائد و ایمانیات میں تطبیق تھی، جبکہ یہاں مغربی فکر و فلسفہ کے ساتھ ساتھ سائنس کے ساتھ بھی مذہب اسلام کی موافقت پیدا کرنا، اعتزالِ جدید کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ پس سر سید احمد خان کی تفسیر تفردات، شذوذات اور ضلالت و کفر پر مبنی اقوال سے بھری پڑی ہے، اگرچہ یہ بہر حال ماننا پڑتا ہے کہ انہوں نے اجماعی دینی عقائد، اساسی ایمانیات اور قرآن و احادیث مبارکہ کی تفسیر و تشریح کو ایک مذاق انتہائی خلوص سے بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان پر یہ اعتراض ہوا کہ معتزلہ قدیم نے بھی تو یونانی فلسفہ و حکمت اور علم ہیئت کے مطابق نصوص کی تاویلات کیں اور بعد ازاں اس فلسفہ کی بنیادیں غلط ثابت ہوئیں تو نصوص کی یہ تشریحات بھی غلط قرار پائیں، لہٰذا اس کا غالب امکان موجود ہے کہ آئندہ زمانہ میں سائنسی علوم میں اس قدر ترقی ہو کہ موجودہ سائنسی نظریات، کہ جن کی نصوصِ قرآن سے مطابقت و موافقت آپ نے اپنی تفسیر میں ثابت کی ہے، غلط ثابت ہوں تو آپ کیا کریں گے؟ سر سید نے ان الفاظ میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے:

> ''پس اگر ہمارے علوم کو آیندہ زمانہ میں ایسی ترقی ہو جاوے کہ اِس وقت [یعنی سر سید کے وقت] کے امورِ محققہ کی غلطی ثابت ہو تو ہم پھر قرآن مجید پر رجوع کرینگے اور اس کو ضرور مطابق حقیقت پاوینگے اور ہم کو معلوم ہو گا کہ جو معنی ہم نے پہلے قرار دیے تھے، وہ ہمارے علم کا نقصان ہے۔ قرآن مجید ہر ایک نقصان سے بری تھا۔'' (تفسیر القرآن: ۲۰/۱)

غلام احمد پرویز

غلام احمد پرویز ۹ جولائی ۱۹۰۳ء کو بھارتی پنجاب کے ایک شہر ''بٹالا'' ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا حکیم مولوی رحیم بخش ایک عالم دین اور چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے بزرگ تھے۔ پرویز صاحب نے ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کے سنٹرل سیکرٹیریٹ میں ملازمت اختیار کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی دوران ان کی ملاقات علامہ اقبال مرحوم سے بھی ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۳۸ء میں ماہنامہ ''طلوع اسلام'' جاری کیا۔

شروع میں مولانا مودودی رحمہ اللہ کے ساتھیوں میں سے تھے اور کہا جاتا ہے کہ یہ غلام احمد پرویز ہی تھے جنہوں نے علامہ اقبال اور چوہدری نیاز علی خان کے سامنے پٹھان کوٹ کے اسلامی تحقیقی ادارے "دار الاسلام" کے لیے مولانا مودودی رحمہ اللہ کا نام پیش کیا تھا ، لیکن بعد میں جب پرویز صاحب نے حدیث کا انکار کیا تو ان کے اور مولانا مودودی رحمہ اللہ کے مابین شدید اختلاف کا ظہور ہوا۔ پرویزی فکر کی تردید میں مولانا مودودی رحمہ اللہ نے "سنت کی آئینی حیثیت" نامی معروف کتاب لکھی جس نے عقلی، منطقی اور نقلی دلائل کی روشنی میں پرویزی فکر کی جڑوں پر کلہاڑا رکھ دیا۔

پرویز صاحب نے ۱۹۵۱ء میں اسسٹنٹ سیکریٹری کے طور پر ریٹائرمنٹ لے لی۔ کراچی میں درسِ قرآن کا آغاز کیا اور ۱۹۵۸ء میں لاہور منتقل ہوئے۔ ۲۴ فروری ۱۹۸۵ء کو فوت ہوئے۔ انہوں نے ایک بیوہ کو سوگوار چھوڑا جبکہ ان کی اولاد نہ تھی۔ ان کا کام اب طلوعِ اسلام ٹرسٹ ، قرآنک ریسرچ سنٹر، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی اور پرویز میموریل لائبریری وغیرہ کے ذریعہ عام کیا جا رہا ہے۔ پرویز صاحب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ تحریک پاکستان کے کارکنان میں سے تھے اور قائداعظم محمد علی جناح کے مشیر خاص بھی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس سیاسی اور معاشرتی مقام (social status) کی وجہ سے ان کا فکر پاکستان کے مقتدر طبقے میں عام ہوا۔

کتب اور علمی کام:

پرویز صاحب نے متفرق موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، جن میں انہوں نے اپنے فکر کو کھل کر بیان کیا ہے۔ ان کتابوں کے نام ذیل میں بیان کیے جا رہے ہیں:

معارف القرآن، مفہوم القرآن، مطالب القرآن، لغات القرآن، تبویب القرآن، نظام ربوبیت، تصوف کی حقیقت، سلیم کے نام، طاہرہ کے نام، قرآنی فیصلے، شاہکارِ رسالت، برق طور، جوئے نور، من ویزداں، جہانِ فردا، ابلیس وآدم، مقام حدیث، مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں، اسبابِ زوالِ اُمت، معراجِ انسانیت، انسان نے کیا سوچا؟، اسلام کیا ہے؟، شعلۂ مستور اور کتاب التقدیر وغیرہ

افکار و آراء:

غلام احمد پرویز صاحب نے کتاب اللہ کی تفہیم میں سنتِ نبوی ﷺ کی ضرورت واہمیت کا انکار کیا اور وہ محض عربی زبان کی مدد سے قرآن مجید کو براہ راست سمجھنے کے مدعی تھے۔ عربی زبان کی مدد سے قرآن کریم کے براہِ راست مطالعہ کے نتیجہ میں پرویز صاحب نے اپنے کئی ایک نئے فلسفے یا نظریات و اَفکار متعارف کروائے۔ برصغیر پاک وہند میں جس شخص نے سب سے پہلے حدیث وسنت کا انکار کیا وہ عبد اللہ چکڑالوی تھے۔ ان کے بعد مولوی احمد الدین امر تسری نے اس فکر کو آگے بڑھایا۔ اس کے بعد حافظ اسلم جیراج پوری نے اس فکر کو مزید مزین کیا اور آخر میں غلام احمد پرویز صاحب نے انکارِ حدیث وسنت کے اس فکر کو باقاعدہ ایک مکتب فکر یا مسلک کی صورت میں مدوّن کر دیا۔ علاوہ ازیں مولوی محب الحق عظیم آبادی، تمنا عمادی، نیاز فتح پوری اور علامہ مشرقی وغیرہ نے بھی انکارِ حدیث کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ایمان باللہ کا تصور:

پرویز صاحب کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظ "اللہ" آیا ہے تو اس سے مراد اللہ کی ذات نہیں بلکہ "اللہ کا قانون" یا "نظام ربوبیت" ہے اور قرآن مجید میں اللہ کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ درحقیقت اللہ کے دیے ہوئے قانون کی صفات ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> "سلیم اگر تم ایک اہم نکتہ سمجھ لو تو قرآن فہمی میں تمہاری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود نکل آئے گا، یعنی ان مقامات میں جہاں قرآن کریم میں لفظ اللہ، استعمال ہوا ہے، اللہ کی جگہ اگر تم اللہ کا قانون، کہہ لیا کرو تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔" (سلیم کے نام: ۱/۱۷۳)

ایک اور مقام پر پرویز صاحب اپنے فلسفۂ نظام ربوبیت یا مارکسزم کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہم اس مقام پر ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں، جسے آگے بڑھنے

سے پہلے سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہم نے ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ...﴾ کی آیت میں بھی اور مذکورہ صدر آیت میں اللہ سے مراد لیا ہے، وہ معاشرہ جو قانونِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لیے متشکل ہو۔" (نظام ربوبیت: ص۱۵۸)

اسی طرح سورۃ ہود کی آیت مبارکہ ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ کی تفسیر میں پرویز صاحب لکھتے ہیں:

"ہم نے (اس آیت میں) اللہ سے مراد لیا وہ معاشرہ جو قانونِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لیے متشکل ہو۔" (نظام ربوبیت: ص۱۵۸)

اور اس قانونِ خداوندی سے پرویز صاحب کی مراد کارل مارکس کا دیا ہوا فلسفہ ہوتا ہے جس سے وہ حد درجہ متاثر نظر آتے ہیں۔ آسان الفاظ میں پرویز کے نزدیک قرآن مجید میں لفظ رب یا اللہ سے مراد وہ معاشرہ ہے جو "قانون الٰہی" یعنی مارکسزم کے فلسفہ پر قائم ہو، اور اس رب یا اللہ کی صفات سے مراد "قانونِ الٰہی" یا مارکسزم کی بنیاد پر قائم معاشرے کی صفات ہیں۔ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے پیدا کردہ خدا پر ایمان لانے اور اس کے دعاوی پر توکل رکھنے سے وہ یقین کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا جو انسان کو احتیاج کی فکر سے بے خوف کر دے۔ یہی وہ خدا تھا جس کے متعلق مارکس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا تصور سرمایہ داروں کی مصلحت کوشیوں کا پیدا کردہ ہے، لیکن خدا کے تصور کا ایک مفہوم وہ ہے جسے خود خدا نے متعین کیا ہے اور جو قرآن کے حروف و نقوش میں جگمگ جگمگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تصور کی رو سے ان مقامات پر خدا سے عملاً مفہوم وہ نظام ہے جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لیے متشکل ہوتا ہے اور اس طرح وہ تمام ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتا ہے جنہیں خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔" (سلیم کے نام: ۲۲۹/۱)

اسی طرح پرویز صاحب کے نزدیک جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے الفاظ ایک ساتھ آئے ہیں تو اس سے مراد "اسلامی نظام حکومت" ہے۔ پرویز صاحب نے اس بنیاد پر "مرکز ملت" کے نام سے اپنا نیا فلسفہ متعارف کروایا۔ اس فلسفہ کے مطابق قرآن

مجید میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے مراد نظام ربوبیت یعنی مارکسزم کی بنیاد پر قائم حکومت کی اطاعت ہے۔ایک جگہ پرویز صاحب لکھتے ہیں :

”حکومت کے انتظامی امور کے لیے ایک مرکز ہو گا اور اس مرکز کے ماتحت افسرانِ مجاز، قرآن کریم میں اس کے لیے خدا اور رسول کی اصطلاح آئی ہے یعنی وہ نظام خداوندی جسے رسول اللہ نے متشکل فرمایا۔ خدا اور رسول کی اطاعت سے مقصود اسی مرکزی حکومت خداوندی کی اطاعت ہے۔“(قرآنی فیصلے:ص۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

”رسول اللہ کے بعد خلیفۃ الرسول، رسول اللہ کی جگہ لے لیتا ہے،اب خدا اور رسول کی اطاعت سے مراد جدید مرکز حکومت کی اطاعت ہوتی ہے۔“ (معراج انسانیت:۳۵۷)

ایمان بالرسالت:

یہ تو پرویز صاحب کا ایمان باللہ کے بارے عقیدہ تھا کہ کبھی تو ان کی اللہ یا رب سے مراد ”نظام ربوبیت“ یا مارکسزم پر قائم معاشرہ ہوتا ہے جبکہ وہ لفظ قرآن مجید میں اکیلا مستعمل ہوا ہو اور کبھی ان کی اس سے مراد اس معاشرے کو قائم کرنے والی مرکزی حکومت یا سنٹرل اتھارٹی اور ان کے ماتحت افسران ہوتے ہے جبکہ وہ لفظ قرآن مجید میں رسول کے ساتھ استعمال ہوا ہو۔اب ایمان بالرسالت کے بارے میں اگر پرویز صاحب کے عقیدہ کا جائزہ لیا جائے تو اس بارے میں پرویز صاحب کا خیال ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ اس سے ان کی مراد وہی مرکز ملت یا سنٹرل اتھارٹی ہے،یعنی خدا اور رسول مل کر ایک اصطلاح بنی ہے اور اس سے مراد مرکز ملت یا سنٹرل اتھارٹی ہے اور رسول کی اطاعت سے مراد اس مرکز ملت کی اطاعت ہے۔ایک جگہ سورۃ النساء کی آیت مبارکہ ﴿يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”اس آیت مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے،اس میں اللہ و رسول سے مراد

مرکز ملت یعنی نظام خداوندی(central authority)اور اولوالامر سے مفہوم افسرانِ ماتحت ہیں۔‘‘(معراج انسانیت: ص ۳۲۲)

پس پرویز صاحب کے نزدیک قرآن مجید میں لفظ رب یا اللہ سے مراد تو وہ معاشرہ ہے جو نظام ربوبیت یعنی مارکسزم کی بنیاد پر قائم ہو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے مراد ایسے معاشرے کو چلانے والی مرکزی حکومت کی اطاعت اور اولوالامر کی اطاعت سے مراد اس مرکزی حکومت کے ماتحت افسران کی اطاعت ہے۔

پرویز صاحب نے ’’قصۂ آدم‘‘ کو انسان کا قصہ قرار دیا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی شخصیت کا انکار کیا ہے۔یعنی ان کے بقول قرآن میں جہاں جہاں لفظ آدم آتا ہے تو اس سے مراد کوئی شخص واحد نہیں تھا بلکہ یہ ایک نوع تھی جس نوع کا اللہ تعالیٰ نے بندروں میں سے انتخاب کیا تھا کہ اسے انسان بنائے۔حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کا بھی انکار کیا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک آدم کسی شخص کا نام ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک نوع ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ارتقا کے مراحل میں انسان بنانے کے لیے بندروں میں سے چن لیا تھا۔

ایمان بالآخرت:

جہاں تک ایمان بالآخرت کا معاملہ ہے تو اس بارے میں پرویز صاحب کا عقیدہ ہے کہ جنت اور جہنم کسی اُخروی زندگی یا حیات میں کسی اچھی بری جگہ یا مکان کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بندۂ مؤمن پر اس دنیا میں طاری ہونے والی کچھ کیفیات کا نام ہے۔ایک جگہ جہنم کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’جہنم انسان کی قلبی کیفیت کا نام ہے، لیکن قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ غیر محسوس، مجرد حقائق کو محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے۔‘‘(جہان فردا: ص۲۳۵)

جنت کے بارے اپنے نظریات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’جہنم کی طرح اُخروی جنت بھی کسی مقام کا نام نہیں، کیفیت کا نام ہے۔‘‘ (جہان فردا:ص ۲۷۰)

ایک اور جگہ جنت کی نعمتوں کے بارے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جنت کی آسائشیں اور زیبائشیں، وہاں کی فراوانیاں اور خوشحالیاں اس دنیا کی زندگی میں حاصل ہو جاتی ہیں، مرنے کے بعد کی جنت کے سلسلہ میں ان کا بیان تمثیلی ہے۔" (نظامِ ربوبیت: ص ۸۲)

پرویز صاحب نے روزِ حشر اور قیامت کا بھی انکار کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"یہ تصور صحیح نہیں کہ جتنے لوگ مرتے ہیں وہ مرنے کے بعد قبروں میں روک لیے جاتے ہیں، اور پھر ان سب کو ایک دن اکٹھا اٹھایا جائے گا اسے حشر یا قیامت کا دن کہا جاتا ہے۔" (جہانِ فردا: ص ۱۸۰)

ایک جگہ قرآنی الفاظ "یوم القیامۃ" کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یوم القیامۃ سے مراد ہو گا وہ انقلابی دور جو قرآن کی رو سے سامنے آیا تھا۔" (جہانِ فردا: ص ۱۳۳)

ایک اور جگہ قرآنی لفظ "الساعۃ" کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الساعۃ سے مراد حق و باطل کی وہ آخری جنگ ہوتی ہے جس سے باطل کی قوتیں شکست کھا کر برباد ہو جاتی ہیں۔" (لغات القرآن: ۹۱۸/۲)

فرشتوں پر ایمان:

فرشتوں کے بارے میں پرویز صاحب کا خیال ہے کہ یہ کوئی علیحدہ سے خدائی مخلوق نہیں ہیں بلکہ بعض انسانی داخلی قوتوں کو ملائکہ کا نام دیا گیا ہے۔ ایک جگہ پرویز صاحب لکھتے ہیں:

"ملائکہ ہماری اپنی داخلی قوتیں ہیں، یعنی ہمارے اعمال کے وہ اثرات جو ہماری ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔" (ابلیس و آدم: ص ۱۶۲)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"ملائکہ یعنی کائنات کی قوتیں جن سے رزق پیدا ہوتا ہے، انسان کے تابع فرمان ہیں۔" (ابلیس و آدم: ص ۵۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"فرشتے، ملائکہ، وہ کائناتی قوتیں ہیں جو مشیت خداوندی کے پروگرام کو

بروئے کار لانے کے لیے زمانے کے تقاضوں کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔"

(اقبال اور قرآن: ص ۱۶۵)

پرویز صاحب نے قرآن مجید میں جنات سے مراد بدوی اور وحشی قبائل لیے ہیں۔ فرشتوں اور جنات کے بارے میں یہ تقریباً وہی نقطہ نظر ہے جو سرسید مرحوم کا تھا۔ تقدیر کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ مجوسیوں نے یہ عقیدہ اسلام میں داخل کیا ہے۔

ایمان بالقرآن:

پرویز صاحب قرآن مجید کو ابدی وحی مانتے ہیں، لیکن حدیث وسنت کے ذریعے قرآن کی تفسیر کے قائل نہیں ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن نے اصول دے دیے ہیں اور ان اصولوں کی تشریح اور توضیح کے مطابق ایک اسلامی نظام حیات یا قانون کی تفصیلات ہم خود طے کریں گے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"قرآن کریم نے صرف اصولی احکام دیے ہیں اور یہ چیز انسانوں پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں جزئی قوانین ایک نظام کے تابع خود مرتب کریں۔" (لغات القرآن: ۴۷۹/۲)

پرویز صاحب قرآن مجید کی تفسیر خود کرنے کے قائل ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے کی گئی قرآنی تفسیر کی ضرورت اور اہمیت کے منکر ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"قرآن کے اصول مکمل غیر متبدل اور ابدی ہیں، اس لیے اب کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ باقی رہا یہ تصور کہ ان اصولوں کو سمجھانے کے لیے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو خدا کی طرف سے ان اصولوں کو سمجھنے کا علم حاصل کرے اور انہیں پھر دوسرے انسانوں کو سمجھائے تو یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم نے کہیں نہیں کہا کہ میری تعلیم سمجھانے کے لیے بھی کسی مامور من اللہ یا ملہم ربانی کی ضرورت ہے۔" (قرآنی فیصلے: ۲۶۰/۳)

قرآنی آیات کی پرویزی تفسیر کے چند نمونے:

پرویز صاحب نے قرآن کے دیگر مقامات کو بھی اپنی تاویلات کا تختہ مشق بنایا ہے،

مثلاً قرآنی آیت ﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾ (العنکبوت:۱۴) یعنی ''حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں ۹۵۰ سال رہے'' کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں ﴿سَنَة﴾ کے لفظ سے مراد فصل ہوتی ہے اور ایک سال میں چار فصلیں ہوتی ہیں، لہٰذا ہزار فصلوں کا معنی ۲۵۰ سال ہوئے اور اس میں سے ۵۰ سال نکال لیں تو ۲۰۰ سال باقی رہ گئے، لہٰذا حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ۲۰۰ برس ہوئی جو معقول بات ہے۔

اسی طرح قرآنی آیت ﴿وَقَالَ يَاأَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ﴾ (النمل:۱۶) یعنی ''حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے'' کی تاویل میں فرماتے ہیں کہ ''منطق'' سے مراد قواعد وضوابط ہیں اور ''طیر'' سے مراد گھوڑے ہیں اور ''منطق الطیر'' سے مراد گھوڑوں کے رسالہ سے متعلق علم ہے۔

﴿أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (آل عمران:۴۹) یعنی ''بلاشبہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی ایک صورت بناتا ہوں پس میں اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے'' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ میں وحی کے ذریعے انسانوں کو حیات نو عطا کروں گا اور وہ خاک سے فضا میں اڑنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ﴿وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا﴾ (البقرۃ:۲۵۹) یعنی ''تم گدھے کی ہڈیوں پر غور کرو کہ کیسے ہم انہیں اٹھاتے ہیں اور انہیں گوشت کا لباس پہناتے ہیں'' کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد رحم مادر میں انسان کا جنین ہے۔ ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾ (النساء:۳۴) یعنی ''مرد عورتوں پر نگران ہیں'' کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ آیت مبارکہ میں ''قوام'' کا معنی روزی مہیا کرنے کا کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں پھینکے جانے والے واقعہ کی تاویل یہ کی کہ مشرکین نے انہیں اپنی دشمنی اور عداوت کی آگ میں پھینکا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے بارے میں یہ تاویل کی کہ یہ غلط فہمی تھی جو خواب کی غلط تعبیر کی صورت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لاحق ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس

غلط فہمی پر عمل سے اس طرح بچالیا کہ ان کی جگہ کچھ اور ذبح ہو گیا۔ عصائے موسیٰ علیہ السلام سے پانی کے پھٹ کر دو دیواروں کی شکل میں کھڑے ہونے کی تاویل یہ کی کہ ﴿كُلُّ فِرْقٍ﴾ سے مراد دونوں جماعتیں یعنی آلِ فرعون اور بنی اسرائیل کی جماعتیں تھیں جو تودوں کی مانند آمنے سامنے کھڑی ہوئیں۔ ﴿فَأَلْقٰهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى﴾ (طٰہٰ) یعنی ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو وہ ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا'' میں عصائے موسیٰ علیہ السلام سے مراد احکام لیے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیے تھے۔ ﴿وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ﴾ (آل عمران: ۴۶) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ماں کی گود میں کلام کریں گے'' کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد ہے کہ وہ چھوٹی عمر میں خوب باتیں کرنے والا ہوگا۔

نماز کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ ایک بے روح رسم اور پرستش ہے لیکن پھر بھی میں جمہور مسلمانوں کے طریقہ پر نماز تو پڑھ لیتا ہوں۔ پرویز صاحب کے نزدیک اقامت صلوۃ سے مراد وہ موقت اجتماعات ہیں جو نظام ربوبیت کی یاد تازہ کرنے کے لیے منعقد کیے جائیں۔ زکوۃ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ زکوۃ کی کوئی شرح اسلام میں مقرر نہیں ہے، ایک اسلامی حکومت سارا مال بھی لے سکتی ہے۔ زکوۃ اور ٹیکس ایک ہی شے ہے، ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قربانی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حج کے علاوہ قربانی ایک رسم اور قرآن پر جھوٹ ہے۔ حرم کعبہ سے مراد مکہ مکرمہ نہیں ہے بلکہ وہ جگہ ہے جہاں سے دینی احکام کا نفاذ ہو۔ بغیر سمجھے تلاوتِ قرآن پر اجر و ثواب کے قائل نہیں ہیں اور اسے ایک عجمی سازش قرار دیتے ہیں۔

تعددِ ازواج کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی آسکتی ہے لیکن اس کی موجودگی میں نہیں۔ قرآنی حدود کے بارے میں فرماتے ہیں کہ قرآن نے جو سزائیں بتلائی ہیں وہ انتہائی سزائیں ہیں اور حدود شرعی نافذ کرنے والے ان سے کم سزائیں بھی جاری کر سکتے ہیں۔

پرویز پر کفر کا فتویٰ:

امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل نے غلام احمد پرویز اور اس کے متبعین کو کافر قرار دیا ہے۔ حکومت کویت کی طرف سے وزارتِ اوقاف کی فتویٰ کمیٹی کے چیئرمین شیخ مشعل مبارک عبداللہ احمد الصباح نے بھی پرویزی عقائد رکھنے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔ سعودی عرب کے سابقہ مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ اور ان کے بعد شیخ عبد العزیز بن عبداللہ آل الشیخ نے بھی غلام احمد پرویز پر منکر حدیث ہونے کی وجہ سے کفر کا فتویٰ عائد کیا ہے۔

غلام احمد پرویز کے کفر کے بارے میں سعودی عرب کے ان علماء کے فتاویٰ کی تائید کرنے والوں میں مولانا محمد ادریس سلفی، مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، مولانا محمد تقی عثمانی، مفتی عبد القیوم ہزاروی، مولانا ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری، ڈاکٹر عبد الرزاق سکندر، مولانا سراج الدین، مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مولانا حافظ عبد القادر روپڑی، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا عبدالحفیظ مکی، مولانا منظور احمد چنیوٹی، مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ مدنی، مولانا مفتی عاشق الٰہی البرنی، مفتی ڈاکٹر عبدالواحد، مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا صفی الرحمن مبارکپوری، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا محمد اجمل قادری، مولانا ریاض الحسن نوری، مولانا عبد الرحمن مدنی، مولانا ابو عمار زاہد الراشدی، مولانا عبد المالک، مولانا مفتی الیاس کشمیری، ڈاکٹر اسرار احمد وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۶۲ء میں غلام احمد پرویز کے بارے میں تکفیر کی ایک مہم چلائی گئی اور اس بارے میں ایک مفصل فتویٰ مرتب ہوا۔ ۲۵۶ صفحات پر مشتمل یہ فتویٰ ''پرویز کے بارے علماء کا متفقہ فتویٰ'' کے نام سے عربیہ اسلامیہ، کراچی سے شائع ہوا۔ اس فتویٰ پر ۱۰۲۸ کے قریب علماء کے دستخط شامل ہیں، جن میں مولانا داؤد غزنوی، حافظ عبد اللہ محدث روپڑی، حافظ عبدالقادر، مولانا مفتی محمود، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا محمد یوسف بنوری، مفتی ولی حسن ٹونکی، محمد عبدالحامد قادری، محمد عبد

السلام قادری، محمد عبدالحلیم چشتی، محمد سلیم الدین چشتی، عبدالکریم قاسمی، محمد بہاء الحق قاسمی رحمہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں کتاب کے آخر میں عالم عرب یعنی مکہ و مدینہ اور مصر و شام کے کبار علماء کے فتاویٰ بھی شامل کیے گئے ہیں۔

غلام احمد قادیانی کے بعد برصغیر پاک وہند میں غلام احمد پرویز دوسرا شخص ہے کہ جس کی جمیع مکاتب فکر کے نمائندہ علماء نے تکفیر کی ہے اور اسے اور اس کے متبعین کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔

پروفیسر محمد طاہر القادری

پیدائش اور تعلیم:

محمد طاہر القادری ۱۹ فروری ۱۹۵۱ء کو جھنگ میں پیدا ہوئے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان کا کسی مکتب فکر سے تعلق نہیں ہے، لیکن اپنی تقریر و تحریر میں بریلوی مسلک کی صریح حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے والد محترم کا نام پروفیسر فرید الدین قادری ہے اور وہ ''سیال'' خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں ۲۴ سال کی عمر میں پروفیسر صاحب کی پہلی شادی ہوئی۔[1] ان کے بڑے صاحبزادہ کا نام حسن محی الدین قادری ہے جو تحریک منہاج القرآن کی مجلس شوریٰ کے صدر ہیں، انہوں نے منہاج یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ اور عربیہ میں ایم۔اے کیا ہے، اور آج کل مصر سے ''میثاقِ مدینہ'' کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی بھی کیا ہے۔ چھوٹے صاحبزادہ حسین محی الدین قادری نے ایم۔بی۔اے کیا ہے اور آج کل آسٹریلیا یونیورسٹی سے گلوبل اکنامکس میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے ۱۹۶۶ء میں میٹرک اور ۱۹۶۹ء میں ایف۔ایس۔سی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پرائیویٹ اسٹوڈنٹ کے طور پر پاس کیا اور ۱۹۷۳ء میں پنجاب یونیورسٹی ہی سے علوم اسلامیہ میں ایم اے کیا۔ علاوہ

[1] کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد انہوں نے دو مزید شادیاں کی۔ ان کی پہلی بیوی جھنگ، دوسری ناروے اور تیسری کراچی سے ہے۔ واللہ اعلم

ازیں ان کے بقول انہوں نے جامعہ قطبیہ رضویہ، جھنگ سے ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۰ء کے دوران درسِ نظامی کی بھی تکمیل کی۔ ۱۹۷۵ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۸۶ء میں انہیں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے اسلامی سزاؤں میں قانون کی ڈگری دی گئی۔ موضوع کا عنوان "Punishment in Islam, Their Classification and Philosophy" تھا۔

پروفیسر طاہر القادری صاحب کے تعلیمی کیریئر میں ہمیں ایل۔ ایل۔ ایم کی کسی ڈگری کا تذکرہ نہیں ملا۔ ایل۔ ایل۔ بی کے بعد براہِ راست پی ایچ ڈی کی ڈگری کا تذکرہ ملتا ہے۔ غالباً ڈاکٹریٹ کی یہ ڈگری شعبہ اسلامیات کے تحت جاری ہوئی ہے، لٰہذا یہ علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ہے، لیکن موضوع کی مناسبت سے اسے اسلامک لاء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری قرار دیا گیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں فیکلٹی آف لاء کے تحت ۱۹۸۶ء میں پی ایچ ڈی کی پہلی دفعہ رجسٹریشن ہوئی اور پروفیسر طاہر القادری صاحب ۱۹۸۶ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے تھے۔ پروفیسر طاہر القادری صاحب کے لاء کالج میں اسلامک لاء یعنی فقہ اسلامی پڑھانے کے سبب سے ان کی علوم اسلامیہ کی پی ایچ ڈی کے بارے میں یہ گمان عام ہو گیا کہ شاید وہ فیکلٹی آف لاء کے پی ایچ ڈی ہیں، حالانکہ وہ علوم اسلامیہ میں پی ایچ ڈی ہیں۔

مذہبی اور سیاسی کیریئر:

پروفیسر محمد طاہر القادری صاحب نے ۱۹۷۴ء میں گورنمنٹ کالج، عیسیٰ خیل، میانوالی میں علوم اسلامیہ کے لیکچرار کے طور پر اپنی سروس کا آغاز کیا اور ۱۹۷۵ء میں اس عہدہ سے استعفا دے دیا۔ ۱۹۷۶ء میں بطور ایڈووکیٹ جھنگ ڈسٹرکٹ کورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۷۶ء میں "جھنگ محاذِ حریت" کے نام سے نوجوانوں کی ایک تنظیم بنائی۔ ۱۹۷۸ء میں جھنگ سے لاہور منتقل ہوئے اور اسی سال پنجاب یونیورسٹی میں لاء کالج میں اسلامک لاء یعنی فقہ اسلامی کے لیکچرار مقرر ہوئے اور ۱۹۸۳ء تک بطور لیکچرار ملازمت کی۔ اسی سال انہیں حکومتِ پاکستان نے وفاقی شرعی عدالت کا مشیر فقہ نامزد

کیا۔

۱۹۸۱ء میں "قرآن کانفرنس" کے ذریعے "منہاج القرآن" کے قیام کی دعوت شروع کی۔ ۱۹۸۲ء میں حکومت پاکستان نے انہیں سپریم کورٹ آف پاکستان کے "شریعت ایپلیٹ بنچ" کا مشیر مقرر کیا۔ ۱۹۸۲ء میں ایران کا دورہ کیا اور آیت اللہ خمینی وغیرہ سے ملاقاتیں کیں۔ ۱۹۸۲ء میں میاں نواز شریف صاحب کی جامع مسجد اتفاق کالونی، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں خطابت شروع کی۔ میاں فیملی سے ان کے یہ تعلقات اوائل ۱۹۸۸ء تک جاری رہے اور اس کے بعد ان میں شدید کشیدگی پیدا ہو گئی۔

اس دوران ۱۹۸۳ء میں پی۔ ٹی۔ وی پر فہم القرآن کے خطبات کا آغاز کیا۔ اسی سال ایم بلاک، ماڈل ٹاؤن میں ۲۰ کنال کی زمین ادارہ منہاج القرآن کے مرکزی سیکریٹیریٹ اور مسجد کے لیے خریدی گئی۔ ۱۹۸۴ء میں ادارہ منہاج القرآن کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اسی سال ان کے بقول انہیں ادارہ منہاج القرآن کے قیام کے حوالہ سے خواب میں نبی ﷺ کی طرف سے کچھ بشارتیں بھی حاصل ہوئیں۔ ۱۹۸۶ء میں منہاج القرآن یونیورسٹی کے قیام کے لیے ٹاؤن شپ میں ۲۰۰ کنال زمین حاصل کی گئی اور ۱۹۸۷ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں ادارہ منہاج القرآن کا دستور منظور ہوا، مرکزی مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کا انتخاب ہوا۔ ۱۹۸۸ء میں میاں فیملی سے ان کے تعلقات کشیدہ ہوئے اور انہوں نے اس فیملی سے ترکِ تعلق کا اعلان کیا۔

۱۹۸۹ء میں "پاکستان عوامی تحریک" کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی اور اس کے تحت ۱۹۹۰ء کے عام انتخابات میں حصہ لیا۔ ۱۹۹۰ء میں ان کی رہائش گاہ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور اسی سال عدالت نے اس واقعہ کو غیر حقیقی اور ڈرامہ قرار دیا اور پروفیسر طاہر القادری صاحب کو غیر صحت مند ذہن کا حامل بتلایا۔ ۱۹۹۵ء میں انہوں نے عوامی تعلیمی منصوبے کا آغاز کیا۔ منہاج انسائیکلوپیڈیا ویب سائیٹ کے مطابق اس تعلیمی منصوبے کے تحت ۱۲ کالجز اور ۵۷۲ اسکولز کام کر رہے ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں "پاکستان عوامی اتحاد" کے صدر بنے جس میں پیپلز پارٹی سمیت ۱۹ سیاسی جماعتیں شامل تھیں۔ ۲۰۰۳ء میں

محترمہ بے نظیر بھٹو نے ان کے ادارہ منہاج القرآن کا دورہ کیا اور اس کی تاحیات رکنیت حاصل کی۔

کتب ورسائل:

پروفیسر طاہر القادری صاحب کی طرف تقریباً ۴۰۶ کتب اور کتابچوں کی نسبت کی جاتی ہے، جن میں سے ۱۹ عربی میں، ۱۳۹ انگریزی میں اور بقیہ اردو زبان میں ہیں۔ پروفیسر طاہر القادری صاحب کی معروف کتابوں میں میلاد النبی ﷺ، ترجمہ عرفان القرآن، المنہاج السوی من الحدیث النبوی، اسلام اور جدید سائنس، دہشت گردی اور فتنہ خوارج، شانِ اولیاء، تخلیقاتِ کائنات، الفیوضات المحمدیۃ، فلسفۂ معراج النبی ﷺ، القول المعتبر فی الامام المنتظر، العرفان فی فضائل وآداب القرآن، احسن الصناعۃ فی اثبات الشفاعۃ، زیارتِ قبور، السیف الجلی علی منکر ولایۃ علی، برکاتِ مصطفی ﷺ، اسلام میں خواتین کے حقوق، شہرِ مدینہ اور زیارتِ رسول ﷺ، ذبح عظیم، ارکانِ اسلام، گستاخانِ رسول کی علامات، شہادتِ امام حسین حقائق وواقعات، شمائلِ مصطفی ﷺ، مسئلہ استغاثہ اور اس کی شرعی حیثیت، عقائد میں احتیاط کے تقاضے، درود شریف کے فضائل وبرکات، مناجات امام زین العابدین، تبرک کی شرعی حیثیت، اسیرانِ جمالِ مصطفی ﷺ، اسلامی نظامِ معیشت کے بنیادی اصول، مرج البحرین فی مناقب الحسنین علیہما السلام، اہل بیت اطہار سلام اللہ علیہم کے فضائل ومناقب، حیاۃ النبی ﷺ، کتاب التوسل، میثاقِ مدینہ کا آئینی تجزیہ، بدعت ائمہ و محدثین کی نظر میں، معارفِ آیۃ الکرسی، عقیدۂ توحید اور غیر اللہ کا تصور، القول الوثیق فی مناقب الصدیق، القول الصواب فی مناقب عمر بن الخطاب، روض الجنان فی مناقب عثمان بن عفان، کنز المطالب فی مناقب علی بن ابی طالب، تذکرہ فرید ملت، بدعت کا صحیح تصور، خوابوں اور بشارات پر اعتراضات کا علمی محاکمہ، حقوقِ والدین، ربّ العالمین کی علمی اور سائنسی تحقیق، امام ابو حنیفہ امام الائمہ فی الحدیث، خصائصِ مصطفی ﷺ، اسمائے مصطفی ﷺ، اسلام کا تصورِ علم، وسائط شرعیہ، عقیدۂ ختمِ نبوت، عقیدۂ توحید کے سات ارکان، النجابۃ فی مناقب

الصحابۃ والقرابۃ، العقد الثمین فی مناقب امہات المؤمنین، اسلام میں بچوں کے حقوق، فلسفۂ صوم، سیرۃ الرسول ﷺ، ایصالِ ثواب اور اس کی شرعی حیثیت، اسلام میں اقلیتوں کے حقوق، فسادِ قلب اور اس کا علاج، حیات و نزولِ مسیح اور ولادتِ امام مہدی علیہما السلام وغیرہ۔

علاوہ ازیں ماہنامہ ''منہاج القرآن'' اور ''دخترانِ اسلام'' کے نام سے مرد و زن کے لیے دو دعوتی و تحریکی رسائل بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ ان کی اکثر و بیشتر کتب ان کی ویب سائیٹ پر ڈاؤن لوڈ کرنے اور آن لائن مطالعہ کی سہولت کے ساتھ پی۔ ڈی۔ ایف اور یونی کوڈ فارمیٹ میں موجود ہیں۔

کتب و رسائل پر تبصرہ:

بعض لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ پروفیسر طاہر القادری صاحب نے اس قدر تنظیمی، انتظامی، تحریکی اور دعوتی مصروفیات کے باوجود اتنی کتابیں کیسے لکھ لی ہیں؟ ہمارے خیال میں جس نے بھی پروفیسر صاحب کی کتب کا بغور مطالعہ کیا ہو اس کے لیے اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، کیونکہ ان میں سے اکثر و بیشتر کتب کی بجائے کتابچے ہیں، مثلاً ''قرآن اور فلسفہ تبلیغ'' ۲۰ صفحات، ''مذہبی اور غیر مذہبی علوم کے اصلاح طلب پہلو'' ۲۴ صفحات، ''تحریکِ منہاج القرآن کا تصورِ دین'' ۲۸ صفحات، ''خدمتِ دین کی توفیق'' ۳۲ صفحات، ''سیرتِ نبوی ﷺ کی عصری و بین الاقوامی اہمیت'' ۳۲ صفحات، ''اقبال اور پیغام عشقِ رسول'' ۳۹ صفحات، ''ہمارا اصل وطن'' ۴۸ صفحات، ''اقبال کا مردِ مؤمن'' ۴۸ صفحات، ''فلسفہ تسمیہ'' ۴۴ صفحات، ''معارفِ اسم اللہ'' ۴۲ صفحات اور ''عمر رسیدہ اور معذور افراد کے حقوق'' ۴۸ صفحات پر مشتمل ہیں۔
دوسری بات یہ ہے کہ یہ کتابچے بھی دراصل پروفیسر صاحب کی تقاریر کو صفحاتِ قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے۔ پروفیسر طاہر القادری صاحب کے ہاں ۱۹۸۷ء میں ہی ''منہاج القرآن رائٹرز پینل'' کے نام سے ایک ادارہ بنایا گیا تھا جو اب ''فرید ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' کے نام سے معروف ہے، جس کے ریسرچ اسکالرز پروفیسر صاحب کی تقاریر کی

صفحۂ قرطاس پر منتقلی، ان کی کمپوزنگ، تقدیم و ترتیب، تخریج و تحقیق اور نشر و اشاعت کی ذمہ داری نبھاتے ہیں۔

تیسری اہم بات یہ بھی ہے کہ پروفیسر صاحب کی شائع شدہ کتب میں تکرار بہت ہے یعنی بعض اوقات یوں بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک کتاب کے پورے پورے ابواب دوسری کتاب میں بھی موجود ہیں۔ دو کتابوں کے ایک ہی جیسے مضامین اور مواد دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ایک کتاب مستقل ہے اور دوسری کتاب اس پہلی کتاب ہی سے تیار کی گئی ہے، مثلاً پروفیسر صاحب نے سیرتِ رسول ﷺ پر ایک کتاب لکھی اور ایک جلد میں ''مقدمہ سیرۃ الرسول'' کے نام سے اس کتاب کا مقدمہ لکھا۔ بعد ازاں اس کتاب کے متفرق ابواب کو مختلف کتابچوں مثلاً ''سیرتِ رسول ﷺ کی دینی اہمیت''، ''سیرتِ رسول ﷺ کی علمی و سائنسی اہمیت''، ''سیرتِ رسول ﷺ کی انتظامی اہمیت'' اور ''سیرتِ رسول ﷺ کی ریاستی اہمیت، وغیرہ کے عناوین سے شائع کر دیا گیا۔ اسی طرح پروفیسر صاحب نے ''کتاب البدعۃ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور بعد ازاں اس کتاب کے دسویں باب کو ایک مستقل کتابچہ ''البدعۃ عند الأئمۃ والمحدثین'' کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ اسی طرح اگر ہم ''اسلام اور جدید سائنس''، ''تخلیق کائنات'' اور ''ربّ العالمین کی علمی و سائنسی تحقیق'، کا تقابلی مطالعہ کریں تو ان تینوں کتب کے مواد کا ایک بڑا حصہ ایک ہی جیسا ہے۔ اسی طرح معاشیات پر اگر پروفیسر صاحب کی کتاب ''اسلام کا معاشی نظام'' اور ''اقتصادیاتِ اسلام'' کا مطالعہ کریں تو ان کے مواد کا ایک بڑا حصہ بھی ایک ہی جیسا ہے۔ علاوہ ازیں ''فلسفہ تسمیہ'' اور ''تسمیۃ القرآن'' کے مواد کا ایک بڑا حصہ ایک جیسا ہی ہے۔

پروفیسر صاحب ''تفسیر منہاج القرآن'' کے نام سے اب ایک تفسیر مرتب کر رہے ہیں، جس کی پہلی جلد سورۃ الفاتحہ کی پہلی چار آیات پر مشتمل ہے اور تقریباً ۸۰۰ صفحات میں ہے۔ شاید اس تفسیر میں پروفیسر صاحب اپنی تمام کتابوں کو جمع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، کیونکہ اس تفسیر کی پہلی جلد میں ہی انہوں نے اپنے کئی ایک کتابچوں مثلاً ''فلسفہ

تسمیہ"، "ربّ العالمین کی علمی وسائنسی تحقیق"، "معارفِ اسم اللہ"، "تخلیقِ کائنات" اور "تسمیۃ القرآن" وغیرہ کو جمع کر دیا ہے۔

چوتھی بات یہ بھی ہے کہ پروفیسر صاحب کی کتب میں موضوع سے غیر متعلق مواد کا ایک بڑا حصہ موجود ہوتا ہے، مثلاً "سیرۃ الرسول ﷺ کی علمی وسائنسی اہمیت" نامی کتابچے میں دو ابواب میں سے ایک باب کا عنوان "قرآن حکیم اور علمی وسائنسی ترقی" ہے۔ پاکستان میں خودکش حملوں کے بارے میں ان کی کتاب "دہشت گردی اور فتنہ خوارج" کے ۹ ابواب میں سے ۳۱ ابواب غیر مسلم اور کفار کے حقوق اور جان ومال کے تحفظ کے بیان میں ہیں، جبکہ پاکستان میں غیر مسلم نہ ہونے کے برابر ہیں اور اصل مسئلہ مسلمان شہریوں کے حقوق اور جان ومال کے تحفظ کا ہے۔

جہاں تک پروفیسر صاحب کی ضخیم کتب کی تیاری کا معاملہ ہے تو اس بارے میں ایک واقعہ نقل کیے دیتا ہوں۔ کئی سال پہلے مولانا لقمان سلفی صاحب، انڈیا سے پاکستان میں "مجلس التحقیق الاسلامی"، لاہور میں تشریف لائے۔ وہ انڈیا میں غالباً مکتبہ ابن تیمیہ کے نام سے لائبریری بنانا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے ادارہ کے بعض نوجوان ساتھیوں سے منہاج القرآن لائبریری کا وِزِٹ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہاں انہوں نے لائبریری کے ساتھ ان کے ریسرچ سنٹر کا بھی وزٹ کیا جس میں اس وقت تقریباً ۴۰ ریسرچ اسکالرز اور متعلقہ معاونین موجود تھے۔ مولانا لقمان سلفی صاحب نے جب ان حضرات سے ان کے کام کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ پروفیسر طاہر القادری صاحب ہمیں خطۃ البحث (synopsis) دیتے ہیں اور اس کے مطابق ہم ایک مکمل کتاب تیار کر دیتے ہیں۔

جہاں تک پروفیسر طاہر القادری صاحب کی کتب کے علمی معیار کی بات ہے تو راقم کو ان پر دو اشکالات ہیں۔ ایک یہ کہ جن کتب کا موضوع مذہبی اور دینی افکار ہیں تو ان میں ضعیف وموضوع روایات کی بھرمار ہے۔ پروفیسر صاحب ایک موضوع پر کلام کرتے وقت صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع سب روایات جمع کر دیتے ہیں، جس سے اس کی جو

مکمل تصویر سامنے آتی ہے اس میں رطب و یابس سب جمع ہوتا ہے، مثلاً پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب ''الدرۃ البیضاء فی مناقب فاطمۃ الزھراء رضی اللہ عنہا''، میں یہ روایت بیان کی ہے:

«إنما سميت بنتي فاطمة لأن الله فطمها وفطم محبيها عن النار»

''میری بیٹی کا نام فاطمہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اور اس سے محبت رکھنے والوں کو دوزخ سے الگ تھلگ کر دیا ہے۔''

امام ابن جوزی، امام ذہبی، ابن عراق الکنانی اور امام شوکانی رحمہم اللہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں مناقب و فضائل سے متعلق ایسی مبالغہ آمیز موضوع روایات اسلامی معاشروں میں بے عملی کو فروغ دینے کا بہت بڑا سبب ہیں کہ جن کے مطابق بعض شخصیات سے صرف محبت کرنا ہی اخروی نجات کے لیے کافی ہے اور دین کے کسی تقاضے یا فریضے پر عمل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب ''وسائط شرعیہ'' میں یہ روایت نقل کی ہے:

«لولاك لما خلقت الأفلاك»

''اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔''

امام صنعانی، ملا علی القاری، علامہ عجلونی اور علامہ البانی رحمہم اللہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر صاحب نے بریلوی مکتب فکر کے عقائد و نظریات کے حق ہونے پر اس روایت سے استدلال کیا ہے۔

«عليكم بالسواد الأعظم»

''تم پر لازم ہے کہ تم سوادِ اعظم کو پکڑو۔''

امام ابن حزم، امام عراقی، ابن عبد الہادی اور علامہ البانی رحمہم اللہ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب 'زیارتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم' میں یہ روایت نقل کی ہے:

«من زار قبري وجبت له شفاعتي»

''جس نے میری قبر کی زیارت کی تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو جاتی ہے۔''

امام نووی، ابن القطان، دمیاطی، امام ابن تیمیہ، ابن عبد الہادی، امام ذہبی، ابن حجر عسقلانی، امام سیوطی، محمد بن محمد الغزی اور الوداعی رحمہم اللہ نے اسے ضعیف یا منکر قرار دیا ہے، جبکہ علامہ البانی اور شیخ بن باز رحمہما اللہ نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب "الفوز الجلی فی التوسل بالنبی ﷺ" میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے محمد ﷺ کے وسیلہ سے مغفرت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے سوال کیا کہ آپ کو محمد ﷺ کے بارے میں علم کہاں سے حاصل ہوا؟ تو حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ میں نے آپ کے عرش پر کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" لکھا ہوا دیکھا تھا۔ اس روایت کو امام بیہقی، امام ابن کثیر، امام شوکانی، امام صنعانی رحمہم اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے جبکہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس روایت کے ضعف پر اتفاق ہے۔ شیخ بن باز اور علامہ البانی رحمہما اللہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ اس طرح اور بھی بیسیوں مثالیں ہیں، لیکن ہم انہی کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

جہاں تک غیر مذہبی عناوین پر کلام کی بات ہے تو ان کتب کا معیار بھی معاصر علمی معیار کے بالمقابل انتہائی سطحی ہے، مثلاً پروفیسر صاحب کی کتاب "اسلام اور جدید سائنس" یا "تخلیق کائنات" کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ اردو ڈائجسٹ میں سائنسی معلومات سے متعلق کسی مضمون کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

پروفیسر صاحب میں تقریر و خطابت کی صلاحیتیں کافی ہیں اور انہیں ہزاروں کے مجمع کو متاثر کرنے کا فن آتا ہے، لیکن ان کی تحریر کی صلاحیت بالکل متاثر کن نہیں ہے اور ان کی تحریر تکرار، سطحی معلومات، غیر مستند و غیر معیاری مواد پر مشتمل اور غیر مرتب ہوتی ہے اور معاصر تحقیقی اسالیب کے مطابق نہیں ہوتی۔ پروفیسر صاحب میں جوشِ خطابت بہت زیادہ ہے اور بعض اوقات اس جوش میں نامناسب باتیں بھی کر جاتے ہیں، مثلاً ایک تقریر میں فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی گلی کے کتوں کا گستاخ بھی کافر ہے۔[1]

[1] http://www.youtube.com/watch?v=5v4wqQ3Gll8

متجددانہ افکار و آراء:

پروفیسر طاہر القادری صاحب خواتین کے حقوق کے بارے میں کافی لبرل سوچ کے حامل ہیں، مثلاً انہوں نے اپنی کتاب "اسلام میں خواتین کے حقوق" میں کہا ہے کہ عورت پارلیمنٹ کی ممبر بن سکتی ہے اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی خواتین مجلس شوریٰ کی ممبر تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ حق مہر کے متعین کرنے کے مسئلہ میں ایک خاتون نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا تھا اور اس اعتراض پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا تھا۔ وہ اس کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کی رو سے یہ بات ملحوظ رہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کسی عوامی جگہ یعنی مارکیٹ، بازار وغیرہ میں ریاستی معاملہ discuss نہیں کر رہے تھے بلکہ یہ مسئلہ پارلیمنٹ میں زیر غور تھا، جس کا مطلب ہے کہ عامۃ الناس کی بجائے منتخب افراد ہی اس عمل مشاورت میں شریک تھے۔ لہٰذا ایک خاتون کا کھڑے ہو کر بل پر اعتراض کرنے سے یہ مفہوم نمایاں طور پر اخذ ہوتا ہے کہ اس دور میں خواتین کو ریاستی معاملات میں شرکت کرنے، حکومت میں شامل ہونے اور اپنی رائے پیش کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ مزید برآں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بل واپس لے لینا اور اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اسلام میں جنسی امتیاز کے لیے کوئی جگہ نہیں اور مرد و زن کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔

پروفیسر طاہر القادری صاحب کے بقول عورت ایک سیاسی مشیر کے طور پر بھی کام کر سکتی ہے اور اس کی دلیل وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت خدیجہ اور دیگر امہات المومنین رضی اللہ عنہن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی مشیر تھیں۔ ان کے بقول عورت کو انتظامی عہدوں پر بھی فائز کیا جا سکتا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شفا بنت عبد اللہ عدویہ رضی اللہ عنہا کو بازار کا نگران مقرر کیا تھا۔ ان کے بقول عورت کو سفیر مقرر کیا جا سکتا ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُمّ کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کو ملکہ روم کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ ان کے بقول وراثت میں حصوں کی تعیین کی بنیاد جنس نہیں ہے، یعنی عورت کو عورت ہونے کی وجہ سے آدھا حصہ نہیں دیا گیا بلکہ مرد کو معاشی ذمہ داریوں کے سبب سے زیادہ حصہ دیا

گیا ہے۔ لیکن اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر عورت کسی گھر میں اپنی ملازمت کے ذریعے گھر کی معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو تو کیا اس صورت میں اسے خاوند کے برابر حصہ ملے گا؟ اگر نہیں، تو پھر عورت کے وراثت میں نصف حصہ ہونے کی یہ علت نکالنا بھی درست نہیں ہے۔

پروفیسر طاہر القادری صاحب نے اپنی کتاب ''اقتصادیاتِ اسلام'' میں ایک مکمل باب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی ریاست یا مملکت کی طرف سے عام شہریوں پر ''تحدید ملکیت'' جائز امر ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ معاشی بحالی کی جدوجہد ''روحِ نماز'' ہے۔ بعض اہلِ علم نے ان کے ان نظریات کو اشتراکیت کی طرف رجحان قرار دیا ہے۔

۱۹۸۷ء تک وہ عورت کی حکمرانی کے قائل نہ تھے، لیکن ۱۹۸۹ء میں ان کا یہ موقف تبدیل ہو گیا اور انہوں نے علماء سے بے نظیر کی حکمرانی قبول کرنے کی اپیل کی۔ ۲۳ نومبر ۱۹۹۳ء کے روزنامہ جنگ کے مطابق طاہر القادری صاحب نے کہا کہ عورت کسی بھی اسلامی ملک کی سربراہ ہو سکتی ہے اور نام نہاد علماء اپنی دکان چمکانے کے لیے عورت کی حکمرانی کے بارے میں فتویٰ جاری کرتے ہیں۔

ننگے سر اور کھلے گریبان والی مغرب زدہ خواتین کے جھرمٹ میں تصاویر کھنچوانا یا ان کے ساتھ مل بیٹھ کر گفتگو کرنے میں پروفیسر صاحب کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے اور اس بارے میں ان کی تصاویر اور ویڈیوز عام ہیں۔ اسی طرح پروفیسر صاحب ۴،۵ دسمبر ۱۹۹۹ء کے اخبارات میں رومانیہ کی فرسٹ سیکریٹری سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب اپنے لیے مولانا کے لقب کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے فلم، سٹیج اور ڈرامہ کے اداکاروں پر مشتمل ''کلچرل ونگ'' تشکیل دیا، جس کے سیکریٹری جنرل معروف اداکار فردوس جمال، صدر فلمی اداکار ندیم، نائب صدر افضال احمد اور چیف آرگنائزر سید نور کو بنایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک منہاج القرآن کی ویب سائیٹ پر ''مشاہیر کے تبصرے'' کے عنوان کے تحت فلم و ڈرامہ کے

اداکاروں ندیم، محمد علی، محمد افضل ریمبو، فردوس جمال، عثمان پیرزادہ، مسرت شاہین، شجاعت ہاشمی، افتخار ٹھاکر اور نسیم وکی وغیرہ کے بھی تبصرہ جات فخریہ انداز میں بیان کیے گئے، مثلاً اداکارہ مسرت شاہین کا یہ تبصرہ نقل کیا گیا کہ ڈاکٹر طاہر القادری صاف وشفاف کردار کے مالک، امن کے سفیر، علم کی روشنی ہیں، تنگ نظر نہیں اور ماڈریٹ ہیں۔

پروفیسر طاہر القادری صاحب فنونِ لطیفہ کے بارے میں بھی نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ان کے مداحین نے ان کی ایسی تصاویر بھی بنا کر شائع کی ہیں جو ہاتھ سے بنائی گئی ہیں، جیسا کہ "ڈاکٹر محمد طاہر القادری: میدانِ کارزار میں" نامی کتاب میں سرورق کی تصویر ہے۔ پروفیسر طاہر القادری صاحب میوزک کے ساتھ قوالی اور صوفیانہ کلام سننے کے قائل اور عادی ہیں اور اسی طرح صوفیانہ رقص وسرود کو بھی جائز اور روحانی ترفع کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ پروفیسر طاہر القادری صاحب کی کئی ایک ایسی ویڈیوز موجود ہیں جن میں وہ قوالی اور صوفیانہ کلام سے آلاتِ موسیقی کے ساتھ محظوظ ہو رہے ہیں اور ان کے سامنے رقص وسرود پیش کیا جا رہا ہے۔ بعض ویڈیوز میں قوالی کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ انہیں سجدہ کرتے بھی نظر آ رہے ہیں۔[1]

موسیقی کے بارے میں اپنے ایک فتویٰ میں پروفیسر طاہر القادری صاحب نے اسے صحیح بخاری کی ایک روایت سے ثابت کیا ہے کہ عید اور خوشی کے موقع پر موسیقی اور رقص جائز ہے اور سلسلہ چشتیہ کا طریق ہے۔[2] اسی طرح اپنے ایک اور فتویٰ میں انہوں نے کہا ہے کہ عشقِ نبی ﷺ میں رقص ووجد جائز ہے۔

اسی طرح ایک اور ویڈیو میں جناب پروفیسر صاحب کے سامنے قوالی "پکارو شاہ جیلانی" فل میوزک اور آلاتِ موسیقی کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے اور پروفیسر صاحب اسے سنتے ہوئے تشریف لاتے ہیں اور قوالوں کے لیے روپوں کی ویلیں دیتے ہیں اور شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکائے ہوئے ہیں۔[3]

---

[1] http://www.youtube.com/watch?v=aO_RD7MFM4Q

[2] http://www.youtube.com/watch?v=YlOAwAPrZ9Y&NR=1

[3] http://www.youtube.com/watch?v=FylE_93LBJU&feature=related

سوال یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ محبت والفت کسے تھی؟ لیکن کیا کبھی ایسا ہوا کہ خلفائے راشدین نے کبھی وجد میں آکر آپ ﷺ کے سامنے دھمال ڈالی ہو، یا عشرۂ مبشرہ نے آپ ﷺ کے سامنے قوالیاں گائی ہوں، یا بدری صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے موسیقی کی سروں پر آپ ﷺ کے سامنے رقص کیا ہو، یا مہاجرین وانصار نے آپ ﷺ کی محبت میں وجد میں آکر آپ ﷺ کو سجدے کرنا شروع کر دیا ہو، یا سابقون الاولون نے عشقِ نبی ﷺ میں آلاتِ موسیقی کے ساتھ قوالیاں سنتے ہوئے گویوں کے لیے درہم ودینار کی ویلیں چڑھائی ہوں؟ وغیرہ۔ یہ عشقِ نبی ﷺ کے کیسے مظاہر ہیں جو حقیقی عشاق سے تو ثابت نہیں ہیں؟

پروفیسر طاہر القادری صاحب غیر مسلموں اور ان سے اتحاد کے بارے میں بھی بہت نرم جذبات رکھتے ہیں۔ غیر مسلموں کے حقوق پر ان کی ایک کتاب بھی ہے۔ انہوں نے ''مسلم کرسچین ڈائیلاگ فورم'' بھی بنایا ہوا ہے جس کے وہ چیئر مین ہیں۔اس فورم کے تحت کرسمس تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس میں قرآن مجید کے ساتھ بائبل کی بھی تلاوت ہوئی۔ عیسائی پادری اور پروفیسر طاہر القادری صاحب نے ''عید میلادِ مسیحؑ'' (کرسمس) کا کیک کاٹا۔ دونوں کی طرف سے امن کی شمع روشن کی گئی۔ پروفیسر طاہر القادری صاحب نے عیسائیوں کو یہ دعوت دی کہ ان کے ادارہ منہاج القرآن کی مسجد عیسائیوں کی عبادت کے لیے کھلی رہے گی۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنے والوں کو ماننے والوں (Believers) میں شمار کیا جاتا ہے اور بقیہ کو نہ ماننے والوں (Non-Believers) میں،اور مسیحی بھائی ماننے والوں میں شامل ہیں۔ یہ خبر ۳ جنوری ۲۰۰۶ء کے روزنامہ اخبارات ایکسپریس، نوائے وقت، دن، انصاف، پاکستان اور جناح وغیرہ میں شائع ہوئی ہے۔پروفیسر صاحب کی بین المذاہب رواداری اور یگانگت کی اس تحریک کے نتائج پاکستان عوامی تحریک کی ویب سائیٹ پر ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں، جس کے مطابق ''منہاج القرآن انٹر فیتھ ریلیشنز'' کے تحت چرچ میں عید میلاد النبی ﷺ کی تقریبات منعقد کی جا رہی ہیں اور ہندوؤں کے مقدس تہوار ''ہولی''

میں شرکت کی جا رہی ہے۔ صلیب کے سائے میں عیسائیوں کے مقدس شہر، ویٹی کن سٹی، میں پروفیسر صاحب کی ساٹھویں سالگرہ منائی جا رہی ہے، وغیرہ۔

ڈاڑھی کے بارے میں بھی پروفیسر صاحب کا موقف انتہائی گنجلک ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ڈاڑھی رکھنا سنت مؤکدہ ہے لیکن کتنی رکھنی چاہیے، ایک مشت یا اس سے کم یا اس سے زیادہ، اس کی شریعت میں کوئی تعیین نہیں ہے، لہٰذا اگر ایک مشت سے کم داڑھی بھی ہو تو بھی جائز ہے اور یہ شرعی حکم کی تعمیل میں داخل ہے۔ ایک مشت یا اس سے زائد داڑھی رکھنا سنت غیر مؤکدہ یا سنن عادیہ میں سے ہے۔ پس جس کی داڑھی ایک مشت سے کم ہو یا ایک مشت ہو یا ایک مشت سے زائد ہو، سب اجر و ثواب میں برابر ہیں۔[1]

عورتوں کے چہرے کے پردے یا نقاب کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے کہ ماحول، عورت کی ضرورت، اس کی عمر اور اس کے ایمان کی مضبوطی کے مطابق عورت کے لیے چہرے کا پردہ کیس ٹو کیس مختلف ہے، چنانچہ کسی خاتون کے لیے یہ واجب، کسی کے لیے مستحب اور کسی کے لیے مباح ہے۔[2]

عورت کے لیے بغیر محرم کے سفر کرنے کے بارے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ میں محرم کی پابندی اس لیے لگائی گئی تھی کہ سیکورٹی کے مسائل بہت زیادہ تھے، جبکہ آج سٹیٹ، پولیس، سسٹم اور سوسائٹی کی طرف سے جو سیکورٹی حاصل ہے وہ محرم کے حکم میں ہے، لہٰذا آج عورت کے سفر کے لیے محرم کی ضرورت نہیں ہے۔[3]

مسلمانوں کے لباس کے بارے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کا لباس باحیا ہونا چاہیے، باقی اس میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر مسلمان انگریزی ہیٹ پہن لیں یا ٹائی باندھ لیں یا دھوتی پہن لیں یا شلوار قمیص پہن لیں یا افریقین یا انڈین یا یورپین لباس پہن

---

[1] http://www.youtube.com/watch?v=T76BSKzcWgw

[2] http://www.youtube.com/watch?v=pR3nDZ8Ofoc&feature=related

[3] http://www.youtube.com/watch?v=Ruen5qLhYmA&feature=related

لیں تو اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔[1]

بدعت کے بارے میں پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب "کتاب البدعۃ" میں یہ موقف پیش کیا ہے کہ دین اسلام میں کسی بھی فعل و عمل کا اضافہ اس وقت تک بدعت نہیں کہلائے گا جب تک کہ اس فعل و عمل کی حرمت کتاب وسنت یا آثارِ صحابہ سے ثابت نہ ہو جائے۔ پس پروفیسر صاحب کے نقطہ نظر کے مطابق دین میں کسی اضافہ شدہ فعل کی حرمت کے بارے میں اگر کتاب اللہ یا سنتِ رسول ﷺ میں کوئی نص یا اقوالِ صحابہ میں کوئی اثر موجود نہ ہو تو وہ فعل جائز اور مباح یا بدعت حسنہ کہلائے گا۔

قرآن مجید کی سائنسی اور باطنی تفسیر:

پروفیسر صاحب نے کئی ایک مقامات پر قرآن مجید کا ایسا ترجمہ یا تفسیر بیان کی ہے جو قرآن مجید کے ظاہر یا اہل سنت والجماعت کے اصول تفسیر کے مطابق نہیں ہے، مثلاً پروفیسر صاحب نے سورۃ النازعات کی ابتدائی پانچ آیات ﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ کے دو تراجم میں ایک ترجمہ یہ بیان کیا ہے کہ:

> "توانائی کی ان لہروں کی قسم جو مادہ کے اندر گھس کر کیمیائی جوڑوں کو سختی سے توڑ پھوڑ دیتی ہیں، توانائی کی ان لہروں کی قسم جو مادہ کے اندر سے کیمیائی جوڑوں کو نہایت نرمی اور آرام سے توڑ دیتی ہیں، توانائی کی ان لہروں۔ کی قسم جو آسمانی خلا و فضا میں بلا روک ٹوک چلتی پھرتی ہیں، پھر توانائی کی ان لہروں کی قسم جو رفتار، طاقت اور جاذبیت کے لحاظ سے دوسری لہروں پر سبقت لے جاتی ہیں، پھر توانائی کی ان لہروں کی قسم جو باہمی تعامل سے کائناتی نظام کے بقا کے لیے توازن وتدبیر قائم رکھتی ہیں۔"

اسی طرح انہوں نے سورۃ النجم کی آیت ﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى﴾ کا ترجمہ کیا ہے:

"قسم ہے روشن ستارے (محمد ﷺ) کی جب وہ (چشم زدن میں شب معراج

[1] http://www.youtube.com/watch?v=AAyc69GM00c

اوپر جا کر) نیچے اترے۔"

سورۃ الزمر کی آیت مبارکہ ﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ کا ترجمہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"(اے حبیب مکرم!) بے شک آپ کو (تو) موت (صرف ذائقہ چکھنے کے لیے) آنی ہے اور وہ یقیناً (دائمی ہلاکت کے لیے) مردہ ہو جائیں گے (پھر دونوں موتوں کا فرق دیکھنے والا ہوگا)۔"

سورۃ القصص کی آیت مبارکہ ﴿اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ﴾ کا ترجمہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ جسے آپ (ہدایت پر لانا) چاہتے ہیں، اسے صاحب ہدایت آپ خود نہیں بناتے، بلکہ (یوں ہوتا ہے کہ) جسے (آپ چاہتے ہیں اسی کو) اللہ چاہتا ہے (اور آپ کے ذریعے) صاحب ہدایت بنا دیتا ہے اور وہ راہ ہدایت کی پہچان رکھنے والوں سے خواب واقف ہے (یعنی جو لوگ آپ کی چاہت کی قدر پہچانتے ہیں، وہی ہدایت سے نوازے جاتے ہیں)۔"

سورۂ مریم کی آیت ﴿اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْکَ شَیْئًا﴾ کا ترجمہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جب انہوں نے اپنے باپ (یعنی چچا آزر سے جس نے آپ کے والد تارخ کے انتقال کے بعد آپ کو پالا تھا) سے کہا: اے میرے باپ! تم ان (بتوں) کی پرستش کیوں کرتے ہو جو نہ سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں اور تم سے کوئی (تکلیف دہ) چیز دور کر سکتے ہیں۔"

سورۃ الکہف کی آیت مبارکہ ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُکُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ کا ترجمہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فرما دیجئے: میں تو صرف (بخلقت ظاہری) بشر ہونے میں تمہاری مثل ہوں (اس کے سوا اور تمہاری مجھ سے کیا مناسبت ہے، ذرا غور کرو) میری طرف وحی کی جاتی ہے (بھلا تم میں یہ نوری استعداد کہاں ہے کہ تم پر کلام الٰہی

اتر سکے)۔"

اسی طرح پروفیسر صاحب نے سورۃ الرحمن کی آیت ﴿مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ﴾ میں دو دریاؤں کی تفسیر حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سے کی ہے۔ اپنی کتاب "ذبح عظیم" میں سورۃ الصافات کی آیت ﴿وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ﴾ میں "ذبح عظیم" سے مراد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو لیا ہے۔

شیعہ ہونے کا الزام:

بریلوی مکتب فکر کے بعض اہل علم نے پروفیسر طاہر القادری پر تفضیلی شیعہ ہونے کا بھی الزام عائد کیا ہے، جیسا کہ مفتی غلام سرور قادری صاحب نے اپنی کتاب "پروفیسر طاہر القادری: علمی و تحقیقی جائزہ" میں کہا ہے۔ پروفیسر طاہر القادری صاحب نے "قصر بتول" میں "مولودِ کعبہ" کے نام سے ایک تقریر میں یہ کہا:

"تمام صحابہ بھی اکٹھے ہو جائیں تو علم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی ثانی نہیں۔"[1]

پروفیسر طاہر القادری صاحب اپنی کتاب "السیف الجلی علی منکر ولایۃ علی" میں کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت تین قسم کی تھی۔ ایک خلافت ظاہری اور دوسری خلافت باطنی، پہلی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ملی اور دوسری حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔ پہلی قسم کی خلافت سیاسی منصب تھا اور دوسری قسم کی خلافت روحانی منصب۔ پہلی قسم کی خلافت انتخابی و شورائی تھی اور دوسری قسم کی وہبی و اجتبائی۔ پہلی قسم کی خلافت کا تقرر عوام الناس نے کیا اور دوسری کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے۔ پہلی قسم کی خلافت کا دائرہ کار فرش تھا اور دوسری کا عرش تک تھا۔ پہلی قسم کی خلافت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد خلفائے راشدین میں جاری ہوئی اور دوسری قسم کی خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد اہلِ بیت کے بارہ اماموں میں جاری ہوئی۔ پہلی قسم میں آپ کی سیاسی وراثت جاری ہوئی اور دوسری قسم میں روحانی وراثت۔ دوسری قسم کی خلافت کو ولایت و امامت بھی کہتے

[1] روزنامہ جنگ، 19 مئی، 1987ء

ہیں۔

پروفیسر طاہر القادری صاحب نے اپنی کتاب ''مسئلہ ولادت امام مہدی'' میں یہ بھی وضاحت کی ہے کہ دوسری قسم کی خلافت یعنی ولایت وامامت کے آخری خلیفہ امام مہدی ہوں گے اور یہ بارہویں خلیفہ یاامام ہوں گے جیسا کہ اہل تشیع کے ہاں بھی امام مہدی ان کے بارہویں امام ہی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''السیف الجلی علی منکر ولایۃ علی'' میں کہاہے کہ حضرت مولا علی المرتضی اور حضرت مہدی الارض والسماء، باپ بیٹا دونوں، اللہ کے ''ولی'' اور رسول ﷺ کے ''وصی'' ہیں۔ پروفیسر طاہر القادری صاحب کے بقول امام مہدی کا ظہور تقریباً کم از کم ۸ سو سال بعد سن ۲۲۰۴ھ میں یا اس کے بھی ایک ہزار سال بعد ہو گا۔[1]

ہمارے خیال میں اگر تو پروفیسر طاہر القادری صاحب کے شیعہ ہونے سے ناقدین کی یہ مراد ہو کہ وہ اہل تشیع کو خوش کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم پر ترجیح دیتے ہیں اور اہل تشیع کے تصورِ ولایت وامامت کے قائل ہیں اور امام مہدی رحمہ اللہ کو اثنا عشریہ اہل تشیع کی طرح اپنا بارہواں امام تسلیم کرتے ہیں تو یہ بات تاحال ان کی تقاریر اور کتب سے بالکل ثابت ہوتی ہے، اِلا یہ کہ وہ مستقبل میں کسی وقت اپنے اس موقف سے رجوع کر لیں۔ یہ درست ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت خلفائے راشدین اور بقیہ جمیع صحابہ پر ثابت کرنے میں اور ان کی ولایت وامامت کے ثبوت میں تکلف و تصنع اور خطابت وبلاغت کا اظہار کرتے ہیں، لیکن وہ فقہ جعفری یا زیدیہ فقہ کے پیروکار نہیں ہیں بلکہ اپنے آپ کو سنی اور فقہ حنفی کا متبع بتلاتے ہیں۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر طاہر القادری صاحب عقائد کے اعتبار سے تفضیلی شیعہ ہیں لیکن فقہ میں حنفی بریلوی ہیں۔

پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب ''کتاب البدعۃ'' میں ان اہل تشیع کے کفر کو یقینی اور

[1] ttp://www.youtube.com/watch?v=iUnbJHW2XNs&NR=1

قطعی قرار دیا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے قائل ہوں، یا حضرت جبریل علیہ السلام کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ غلطی سے وحی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بجائے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر لے آئے، یا قرآن میں تحریف یا ترمیم کا عقیدہ رکھیں، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائیں، یا یہ عقیدہ رکھیں کہ وصالِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم مرتد ہو گئے تھے، یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا انکار کریں۔

پروفیسر طاہر القادری صاحب کے خواب:

پروفیسر صاحب پر ان کے خوابوں کی وجہ سے بھی مختلف مذہبی اور غیر مذہبی حلقوں کی طرف سے نقد ہوتی ہے۔ یہ خواب تفصیلی ہیں اور ان کی آڈیوز اور ویڈیوز موجود ہیں اور ان میں سے بعض خواب انٹرنیٹ پر ''یوٹیوب'' نامی ویب سائیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔ ایک خواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سندھ کے کسی شہر میں ہوتی ہے، لوگ زیارت کے لیے جاتے ہیں لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو زیارت نہیں کرواتے۔ بالآخر پروفیسر صاحب اکیلے رہ جاتے ہیں اور انہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پروفیسر صاحب سے شکوہ کرتے ہیں کہ میں اہل پاکستان، دینی جماعتوں، اداروں اور علماء سے نالاں ہو کر واپس جا رہا ہوں، کیونکہ انہوں نے میری قدر نہیں کی اور اسی لیے میں نے ان سے ملاقات بھی نہ کی۔ پروفیسر صاحب اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی منتیں سماجتیں کرتے ہیں، پاؤں پڑتے ہیں، روتے ہیں تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دل نرم پڑ جاتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شرط پر پاکستان رکنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ پروفیسر طاہر القادری صاحب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی میزبانی کریں گے، پاکستان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹھہرنے کا انتظام، کھانے پینے کا انتظام، پاکستان میں اندرونِ ملک سفر کے ٹکٹ اور قیام کا انتظام اور واپس مدینہ تک کے ٹکٹ کا انتظام پروفیسر صاحب کریں گے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم ''ادارہ منہاج القرآن'' قائم کرو میں وہاں تشریف لاؤں گا۔

ایک دوسرے خواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جمعہ کا دن ہے اور اذان کا وقت ہے۔ مسجد

نبوی کا مقام ہے اور اجتماعِ عام ہے۔ مؤذن اذان دینے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ اس مؤذن کو ہٹا دو، آج جمعہ کی اذان طاہر دے گا۔

ایک اور خواب کا خلاصہ یہ ہے کہ صحرائی علاقہ میں ایک ریتلے ٹیلے پر اللہ کے رسول ﷺ تشریف فرما ہیں۔ آپ کی داہنی جانب حضرت ابو بکر صدیق اور بائیں جانب حضرت عثمان ہیں۔ میں چھوٹا سا بچہ تھا اور اللہ کے رسول ﷺ نے دائیں طرف اپنے پہلو میں لے لیا اور چاروں خلفائے راشدین سے میرا اور مجھ سے ان کا تعارف کروایا۔
ایک خواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری عمر ۶۳ برس مقرر کی جو اللہ کے رسول ﷺ نے بڑھا کر ۶۶ برس کر دی، لیکن قادری صاحب نے قبول نہ کی، کیونکہ اس طرح عمر کے سلسلہ میں سنتِ نبوی کی خلاف ورزی کا ارتکاب تھا تو اللہ کے رسول ﷺ نے پروفیسر صاحب کی بات مان کر دوبارہ ۶۳ سال کر دی۔

ناقدین:

جناب پروفیسر طاہر القادری صاحب کے ناقدین میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک مذہبی اور دوسرے غیر مذہبی۔ مذہبی افراد میں سے تقریباً چاروں مسالک بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث اور اہل تشیع کے بعض اہل علم نے ان پر نقد کی ہے۔ پروفیسر طاہر القادری صاحب پر نقد کا آغاز بریلوی مکتب فکر طرف سے ہوا۔ مشیر وفاقی شرعی عدالت مفتی غلام سرور قادری صاحب نے ''پروفیسر طاہر القادری: علمی و تحقیقی جائزہ'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جو ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مفتی صاحب نے پروفیسر طاہر القادری صاحب کے بارے میں یہ کہا ہے کہ انہیں دیکھ کر قرآن پڑھنا بھی نہیں آتا ہے اور نہ ہی وہ صحیح ترجمہ کر سکتے ہیں۔ مفتی صاحب نے پروفیسر طاہر القادری صاحب کی آڈیو کیسٹس سے بھی ان کی عربی عبارات کی کچھ اغلاط نقل کی ہیں۔ مفتی صاحب نے پروفیسر صاحب پر یہ بھی طعن کیا ہے کہ پروفیسر صاحب دو انگل ڈاڑھی رکھنے کو بھی سنت قرار دیتے ہیں۔ مفتی صاحب نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ پروفیسر

صاحب نے عورت کی آدھی کے بجائے مکمل دیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کا یہ موقف اجماع امت کے خلاف ہے۔ مفتی صاحب نے پروفیسر صاحب کو تفضیلی شیعہ قرار دینے کے علاوہ بھی بہت سنگین الزامات کی نسبت ان کی طرف کی ہے۔

اسی طرح مولانا ابو داؤد محمد صادق نے "پروفیسر طاہر القادری: علمائے اہل سنت کی نظر میں" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جس کا دوسرا نام "خطرے کی گھنٹی" بھی معروف ہوا۔ اسی طرح محمد نواز کھرل نے ان کے بارے میں "متنازعہ ترین شخصیت" نامی کتاب لکھی ہے۔

مرکزی دار العلوم اہل سنت جامعہ رضویہ مظہر اسلام، فیصل آباد کے بریلوی علماء مولانا غلام رسول رضوی، مفتی محمد اسلم رضوی، محمد حبیب الرحمن، ابو صالح محمد بخش، محمد نظام الدین، محمد سعید نقشبندی وغیرہ نے پروفیسر طاہر القادری کے خلاف ایک متفقہ فتویٰ جاری کیا جس میں پروفیسر صاحب کو اہل سنت کا دشمن قرار دیا گیا۔ ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے کو ناجائز اور ان کے ادارہ منہاج القرآن میں بچوں کو تعلیم دینے سے روکا گیا۔ مفتی اشرف قادری صاحب نے پروفیسر طاہر القادری صاحب کے بارے میں کہا ہے کہ یہ شخص پہلے صحیح العقیدہ سنی اور حنفی تھا لیکن بعد میں مجتہد بن گیا۔ اس نے عورت کی دیت کے مسئلہ میں اجماعِ امت کی خلاف ورزی کی ہے اور یہ کم از کم اہل سنت والجماعت میں سے نہیں ہے۔ انہوں نے پروفیسر صاحب پر یہ بھی الزام عائد کیا ہے کہ انہوں نے امام خمینی کی وفات پر ایک امام باڑے میں کالا جبہ پہن کر تقریر کی اور کہا کہ پاکستان کا بچہ بچہ خمینی ہو گا اور خمینی کا جینا علی کی طرح تھا اور مرنا حسین کی طرح۔ مفتی اشرف قادری صاحب نے طاہر القادری صاحب کو بد ترین گمراہ اور فاسق بھی قرار دیا ہے۔[1]

گدی نشین سید عرفان شاہ صاحب نے پروفیسر طاہر القادری صاحب کو "شیخ الاسلام" کے بجائے "شیخ فی الاسلام" یعنی بوڑھا مسلمان کا لقب دیا ہے۔ سید عرفان شاہ صاحب نے پروفیسر طاہر القادری صاحب پر اس اعتبار سے نقد کی ہے کہ پروفیسر صاحب

[1] http://www.youtube.com/watch?v=DmgYxJcMqxg

نے گستاخ عیسائیوں کے ساتھ اخلاق کا حکم دیا ہے۔[1]

مولانا کوکب نورانی صاحب نے پروفیسر طاہر القادری صاحب پر یہ نقد کی ہے کہ عیسائیوں کو اپنی مسجد میں عبادت کی دعوت دینے کے بعد ہم اسے سنی ماننے کو تیار نہیں ہیں اور یہ شخص "طاہر القادری" سے "طاہر الپادری" بن گیا ہے۔[2]

اہل حدیث میں سے حکیم محمد عمران ثاقب صاحب نے 'ڈاکٹر طاہر القادری کی علمی خیانتیں، اور "طاہر القادری: خادم دین متین یا افاک اثیم" کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں، جن میں انہوں نے پروفیسر طاہر القادری صاحب کے تصورِ بدعت، شرک، وسیلہ، استغاثہ، شیعیت اور میلاد النبی ﷺ کے حوالہ سے نظریات پر شدید نقد کی ہے۔ دیوبندی مکتب فکر سے متعلق بعض اہل علم انہیں "کینیڈین شیخ الاسلام" اور بعض سلفی اہل علم انہیں "شوخ الاسلام" کا لقب دیتے ہیں۔ ماہنامہ "الاحرار" ملتان اور سہ ماہی "ایقاظ" میں اس بارے میں پروفیسر صاحب پر بعض تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں سیارہ ڈائجسٹ اور قومی ڈائجسٹ میں ان پر ناقدانہ مضامین شائع ہوئے ہیں۔

غیر مذہبی لوگوں میں سے پروفیسر صاحب پر جن کی نقد معروف ہوئی ان میں ایک عدالتی فیصلہ بھی ہے۔ اس عدالتی فیصلے کا پس منظر یہ ہے کہ پروفیسر صاحب کی رہائش گاہ ماڈل ٹاؤن، لاہور پر ۲۱ اپریل ۱۹۹۰ء کی صبح کو پراسرار فائرنگ کا سانحہ پیش آیا اور پنجاب حکومت کی درخواست پر اس کیس کی تحقیق و تفتیش کے بعد عدالت نے فیصلہ جاری کیا۔ اس فیصلے کا ایک اقتباس ہم پروفیسر صاحب کے حق میں لکھی گئی ایک کتاب سے یہاں نقل کر رہے ہیں:

"بیان کردہ فائرنگ حقیقی واقعہ نہیں تھا۔ مسٹر قادری کا نقصان ان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے... ان کے اس لایعنی طرز عمل سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ مسٹر قادری ذہنی طور پر بیمار آدمی ہیں، اس لیے وہ اپنے دشمنوں سے جو کوئی بھی ہو سکتے ہیں، حد درجہ خوفزدہ ہوئے بلکہ دشمن فوبیا میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن ان

[1] http://www.youtube.com/watch?v=3MXpWYDNCm0&feature=related

[2] http://www.youtube.com/watch?v=qLPLtUH-eyo&feature=related

دلائل کو آسانی سے زیر بحث لایا جا سکتا تھا۔ یہ واقعہ کہ مسٹر قادری، اپنے مخصوص خوابوں کو بیان کرنے کے لیے بے قرار رہتے ہیں ان کے غیر صحت مندانہ ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو خواب آتے بھی ہوں، لیکن ان کے تعصبات کو بھی بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جبکہ وہ اپنے خوابوں کو ایک خاص انداز میں بیان کرتے ہیں اور اپنی شخصیت کو ایک خاص رنگ دیتے ہیں، اس ذہنی ساخت کی شخصیت سے ہر چیز ممکن ہے۔ نصف رات کے سمے ان پر مسلح آدمیوں کے حملے کے ڈرامے کو بھی اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔" (ڈاکٹر محمد طاہر القادری میدانِ کار زار میں: ص ۲۰۹۔۲۱۰، انکشاف پبلشرز، لاہور)

عدالت کے اس فیصلہ کے مطابق پروفیسر صاحب نے شہرت کے حصول کے لیے اپنی رہائش گاہ پر خود ہی فائرنگ کروائی تھی اور اس کی ذمہ داری اپنے سیاسی مخالفین پر عائد کر دی تھی۔

خلاصۂ کلام:

پروفیسر صاحب کے بارے میں اس وقت دو انتہائیں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔ ایک تو ان کے مداحین ہیں جو انہیں شیخ الاسلام، مجتہد مطلق اور قبلہ حضور سے کم درجہ دینے کو تیار نہیں ہیں اور دوسرے ان کے شدید ناقدین ہیں جو انہیں طاہر الپادری، مرتد اور صلیبیوں کا مفتی جیسے القابات سے نوازتے ہیں۔ ایسے میں اس بات کی بہت ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ پروفیسر صاحب کے پیدہ کردہ علمی اور اخلاقی بگاڑ و فساد پر معتدل نقد کی جائے کہ جس میں تکفیر و تضلیل پر مبنی فتویٰ کی زبان استعمال نہ ہوئی ہو۔ ایک نقد ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں جو پروفیسر صاحب کے متجددانہ افکار پر مشتمل کتاب "متنازعہ ترین شخصیت" پر ایک تبصرہ ہے اگرچہ اس نقد میں کچھ الفاظ سخت نقل ہو گئے ہیں لیکن اپنی روح میں یہ نقد بالکل درست ہے:

"متنازعہ ترین شخصیت، دراصل پروفیسر طاہر القادری کے سائیکل سے لینڈ کروزر تک کے ارتقائی سفر کا جائزہ ہے جس پر نہایت مثبت انداز میں تنقید کی گئی

ہے۔ جناب طاہر القادری کا المیہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ قول و فعل کے تضاد کا شکار رہے ہیں۔ اس داخلی و خارجی دوہرے پن نے ان کی شخصیت کو بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک طرف وہ بے نظیر بھٹو کو اپنی بہن قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف محترمہ کو کرپٹ بھی کہتے ہیں۔ ایک طرف وہ میاں نواز شریف کو سیکورٹی رسک قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف انہیں ایٹمی دھماکہ کرنے پر مبارک باد بھی پیش کرتے ہیں۔ ایک طرف کہتے ہیں کہ احتجاج اور ریلیوں سے ملک میں بدامنی پھیلے گی، دوسری طرف وہ خود بڑے اہتمام سے احتجاجی جلسے، جلوس اور ریلیاں منعقد کرواتے ہیں۔ ادھر کلچرل میلہ کا انعقاد کرواتے ہیں تو ادھر میلاد کانفرنس کا اہتمام بھی دھوم دھام سے کرتے ہیں۔ علامہ طاہر القادری نے گزشتہ کئی برسوں سے ماڈریٹ، پروگریسو اور سیکولر شخصیت کا گاؤن پہن رکھا ہے۔ وہ خواب، کہانیاں، بے وقت کی راگنیاں اور اوٹ پٹانگ باتوں سے قوم کو محظوظ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی پریس کانفرنسیں رطب ویابس، لاحاصل اور مناقضات سے بھرپور ہوتی ہیں۔ بہترین درسگاہ ادارہ منہاج القرآن، جن عظیم الشان مقاصد کے حصول کے لیے قائم کیا گیا تھا، بد قسمتی سے وہ پروفیسر طاہر القادری کی منفی سیاست کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ مہاتما بننے کی اندھی خواہش اور خود کو عقل کل سمجھنے کے نفسیاتی عارضے کا شکار ہو کر ان کی شخصیت ایبسٹریکٹ آرٹ کا شاہکار بن چکی ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے والے نوجوان جنہوں نے کارِ زمانہ کی باگ ڈور سنبھالنا تھی، اپنی اوچھی حرکات کی بدولت معاشرے میں ہدف تضحیک بن کر رہ گئے ہیں۔ ''مصطفوی انقلاب'' کے نعرہ سے دستبرداری کے بعد ''وزیر اعظم طاہر القادری'' ان کا نصب العین ٹھہرا۔ نجانے انہیں کس کی نظر کھا گئی کہ ان کا معیار ایک مسخرے کی سطح سے بھی نیچے گر گیا۔ احسن تقویم کی بلندیوں کی طرف گامزن اسفل السافلین کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گئے۔ قال اللہ و قال الرسول کی ایمان افروز آوازوں سے مہکنے والی کلاس روموں میں اب ''بن کے مست ملنگ رہیں

گے، طاہر تیرے سنگ رہیں گے" کے ترانے، بھنگڑے ڈالتے ہوئے، فلمی طرز پر گانے گائے جاتے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ شاید انہیں بتایا گیا ہو کہ اس مجاہدہ سے عرفان حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ اس عاشقی میں عزت سادات بھی گنوا بیٹھے ہیں۔ اہل بصیرت اس صورتحال کو زوال اور عذاب سے تعبیر کرتے ہیں۔ واقعی جہاں لنگڑے بھنگڑے ڈالیں، اندھے بیچیں، سر کٹے دستاریں فروخت کریں، گنجے مقابلہ آرائش گیسو کا انعقاد کروائیں اور ٹنڈے شمشیر زن ہونے کا دعویٰ کریں، وہاں سے کس خیر کی توقع کی جا سکتی ہے؟ ایسی پستی ہے، اہل نظر، آشوب چشم اور اہل فکر، ضیق النفس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ انہیں اس ناقابل تلافی نقصان کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جناب طاہر القادری کا یہ جرم نہایت سنگین ہے کہ انہوں نے محض سستی شہرت، دولت اور سیاسی اقتدار کی خاطر ایسے خوابوں کا سہارا لیا جن میں حضور نبی کریم ﷺ کی صریحاً توہین پائی جاتی ہے۔ ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ کوئی نابغہ روزگار اس حد تک ذہنی قلاش ہو سکتا ہے۔"

مصنف کی نئی کتاب

اسلامی نظریہ حیات

مصنف کی نئی زیر ترتیب کتاب کا عنوان "اسلامی نظریہ حیات" (Islamic Ideology of Life) ہے۔ یہ کتاب فلسفہ، سائنس، مذہب، لسانیات، علمیات، فنون لطیفہ، معاشیات، معاشرت وغیرہ جیسے موضوعات پر مختصر اور جامع الفاظ میں اسلامی بیانیے (Islamic Narrative) کا بیان ہے۔ یہ بیانہ بارہ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ ایک صد سے زائد صفحات پر مشتمل حواشی میں اس کے اختصار کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب: مبدا اور معاد (Entry and Exit)

دوسرا باب: روایت اور فہم (Tradition and Hermeneutic)

تیسرا باب: علم اور قوت (Power and Knowledge)

چوتھا باب: ایمان اور اخلاق (Belief and Ethics)

پانچواں باب: ادبیات اور جمالیات (Literature and Aesthetic)

چھٹا باب: عقل اور منطق (Intellect and Reason)

مصنف کی نئی کتاب

مکالمہ

مصنف کی نئی زیر ترتیب کتاب کا عنوان "مکالمہ" (dialogue) ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

- ابراہیم أحمد العدوی، الدکتور، رشید رضا الإمام المجاهد، المؤسسة المصرية العامة، مصر۔
- أبو حنيفة، النعمان بن ثابت، الفقه الأكبر، مكتبة الفرقان، الإمارات العربية۔
- أبو داود سليمان بن الأشعث الأزدي، سنن أبي داود، دار الرسالة العالمية، بيروت۔
- أحمد آمین، زعماء الإصلاح فی العصر الحديث، مكتبة النهضة المصرية، قاهرہ، 1948ء۔
- البيهقي، أحمد بن الحسين بن علي الخراساني، الأسماء والصفات، مكتبة السوادي، جدة۔
- رشيد رضا، شيخ، تفسير المنار، الهيئة المصرية العامة، مصر۔
- سليمان بن صالح الخراشی، القرضاوی فی الميزان، دار الجواب، الرياض۔
- سيد بن حسين العفانی، الدکتور أعلام وأقزام فی میزان الاسلام، دار ماجد عيری، جدة۔
- سید یوسف، جمال الدین الأفغانی والثورة الشاملة، الهيئة المصرية العامة للكتاب، قاهرہ، 1999ء۔
- طه حسین، الدکتور، فی الشعر الجاهلی، مکتبة دار الندوة الألكترونية۔
- عبد الرحمن رافعی، جمال الدين الأفغانی، دار الکاتب العربی، بيروت۔
- عبد القادر مغربی، جمال الدين الأفغانی: ذکریات و أحادیث، دار المعارف، مصر۔

مصادر و مراجع

- فتحی بشیر البلعاوی، الرجل الصنم، الجامعة الإسلامية، فلسطين، 2008ء۔
- فهد بن عبد الرحمن بن سليمان الرومی، منهج المدرسة العقلية الحديثه فی التفسير، إدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد، الرياض۔
- مجمع اللغة العربية، المعجم الوسيط، دار الدعوة، القاهرة ۔
- محسن عبد الحميد، ڈاکٹر، جمال الدين الأفغانی المصلح المفترى عليه، مؤسسة الرسالة، بيروت۔
- محمد المخزومی، خاطرات جمال الدين أفغانی، دار الفكر الحديث، لبنان۔
- محمد عمارة، الدكتور، الأعمال الكاملة لمفتی محمد عبده، دار الشروق، مصر۔
- محمد عمارة، ڈاکٹر، جمال الدين الأفغانی موقظ الشرق وفيلسوف الاسلام، دار الشروق، قاهره ۔
- محمد مظہر الدین صدیقی، مترجم، حیات مفتی محمد عبدہ، اقبال اکیڈمی، لاہور۔ چارلس ایڈیمس کی کتاب "Islam and Modernism in Egypt" کے بعض ابواب کا ترجمہ ہے۔
- محمود أبو رية، جمال الدين الأفغانی، دار المعارف، مصر۔
- محمود مهدی إستنبولی، طٰه حسين فی ميزان العلماء والأدباء، المكتب الإسلامی، بيروت، 1983ء۔
- مرزا لطف الله خان أسد آبادی، جمال الدين أسد آبادی، تعليق و تقديم: ڈاکٹر عبدالنعيم محمد حسين، دار الكتاب اللبنانی،

بیروت، 1973ء۔

- مصطفی زین، ذئب الأناضول، برطانیه، 1991ء
- الندوة العالمية للشباب الإسلامی، الموسوعة الميسرة فی الأديان والمذاهب والأحزاب المعاصرة، دار الندوة العالمية للطباعة والنشر والتوزيع، الرياض۔
- وهبة الزحيلی، الفقه الإسلامی وأدلته، دار الفكر، دمشق
- ابو الحسن علی ندوی، مولانا، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، کراچی۔
- اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، طبع اول، ۱۹۶۴ء۔
- سر سید احمد خان، تفسیر القرآن، رفاہ عام سٹیم پریس، لاہور۔
- سید قاسم محمود، انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، الفیصل ناشران، لاہور۔
- عبدالرحمن کیلانی، مولانا، آئینہ پرویزیت، مکتبہ السلام، لاہور، ۲۰۰۴ء۔
- عمران ثاقب، محمد، حکیم، ڈاکٹر طاہر القادری کی علمی خیانتیں، منہاج القرآن والسنۃ، گوجرانوالہ، ۲۰۰۸ء۔
- عمران ثاقب، محمد، حکیم، طاہر القادری: خادم دین متین یا افاک اثیم، منہاج القرآن والسنۃ، گوجرانوالہ، ۲۰۱۱ء۔
- غلام سرور قادری، مفتی، پروفیسر طاہر القادری: علمی و تحقیقی جائزہ، مصباح القرآن، لاہور، ۱۹۸۸ء۔
- ماہنامہ محدث، فتنہ انکار حدیث نمبر، ستمبر ۲۰۰۲ء، لاہور۔
- محمد دین قاسمی، پروفیسر ڈاکٹر، تفسیر مطالب الفرقان کا علمی و تحقیقی جائزہ، ادارہ معارف اسلامی، لاہور
- محمد دین قاسمی، پروفیسر ڈاکٹر، جناب غلام احمد پرویز اپنے الفاظ کے آئینے میں، بیت الحکمۃ، لاہور، ۲۰۰۶ء۔

- محمد دین قاسمی، پروفیسر ڈاکٹر، جناب غلام احمد پرویز کے نظام ربوبیت پر ایک نظر، بیت الحکمۃ، لاہور، ۲۰۰۷ء۔
- محمد نواز کھرل، متنازعہ ترین شخصیت، فاتح پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء۔
- ہفت روزہ الاعتصام، حجیت حدیث نمبر، دارالدعوۃ السلفیہ، لاہور، ۱۹۵۶ء۔
- www.dorar.net
- ar.wikipedia.org
- en.wikipedia.org
- muntada.islamtoday.net
- www.atajew.com/
- www.ataturk.com
- www.islamonline.net
- www.minhaj.info
- www.minhaj.org
- www.minhaj.org.pk
- www.minhajbooks.com
- www.minhajsisters.com
- www.muslim.net
- www.pat.com.pk
- www.qaradawi.net/
- www.saaid.net
- www.zuhayli.com